مثنوی

فریادِ داغ

فصیح الملک داغ دہلوی

مع

مقدّمہ

تمکین کاظمی

مثنوی

فریادِ داغ

میں نے سب کام چھوڑ کر اول سے آخر تک مقدمہ پڑھا ماشاء اللہ کیا داد تحقیق دی ہے ایسا معلوم ہونے لگا کہ گویا میری آنکھوں کے سامنے یہ واقعہ گزرا ہے۔

مجھے بڑی مسرت اس بات کو دیکھ کر ہوئی کہ داغ کے سلسلہ میں تمکین صاحب جذباتی سے زیادہ واقعاتی نظر آرہے ہیں۔

امتیاز علیخاں عرشی رامپوری

فریاد داغ کے مقدمے میں تمام ضروری مواد سمیٹ لیا گیا ہے اور یہ بہت اچھا تحقیقی کارنامہ ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور
جنرل سیکرٹری انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڈھ

مثنوی

فریادِ داغ

مثنوی

فریادِ داغ

فصیح الملک داؔغ دہلوی

مع

مقدّمہ

تمکین کاظمی

ناشران

آئینۂ ادب، چوک انارکلی
لاہور

جملہ حقوق محفوظ

بار دوم: ۱۹۵۷ء

تعداد: ۱۰۰۰

قیمت: تین روپے

اشرف پریس لاہور میں
طبع ہوا

محبِّ گرامی تصدّق حسین تاجؔ

کے نام

فصیح الملک داغ دہلوی

نواب صاحب سلام

میں خیر کا طالب ہوں ہر طرح کار منظور نہیں

فرصت کی کیا صورت ہوں اس بارش میں بمشکل آئے

دو صاحب کل سے وارد ہیں اور آپ کے مشتاق

اونکا مکان اگر آ جاوں بگھی اوسکی فرصت

ہو بس سے یہاں تو کبھی ہوتا نہیں زیادہ نیاز

فصیح الملک داغ دہلوی

۲ جمادی الاول سنہ ۱۳۱۶

یکشنبہ

مقدمہ

داغ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو چہار شنبہ کے روز دن کے دو بجے چاندنی چوک دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شمس الدین خاں تھا جو فیروز پور جھرکہ کے رئیس اور احمد بخش خاں کے بیٹے تھے، یہ خاندان دہلی کا مشہور و معروف خاندان تھا، غالب کے خسر الٰہی بخش خاں انہیں شمس الدین خاں کے چچا اور امین الدین خاں و ضیاء الدین خاں نیر و رخشاں ان کے چھوٹے بھائی تھے

شمس الدین خاں نے ایک انگریز عہدہ دار ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں پھانسی پائی، انہوں نے فریزر کو کیوں قتل کرایا اس کے متعلق دو روایتیں مشہور ہیں ایک تو یہ کہ شمس الدین خاں کی ایک بہن جہانگیر انامی تھیں جنہیں فریزر نے کسی طرح دیکھ لیا اور شمس الدین خاں سے ان کی بہن کا ذکر والہانہ انداز میں کیا جسے سن کر انہیں سخت تکلیف ہوئی اور انہوں نے فریزر کے قتل کے لئے کریم خاں عرف جامارو کو آمادہ کیا جس نے فریزر کو قتل کیا،

دوسری یہ روایت مشہور ہے کہ شمس الدین خاں کے والد احمد بخش خاں نے اپنی زندگی ہی میں جائداد کی تقسیم کر دی تھی مگر شمس الدین خاں ہٹ دھرمی سے اپنے علاتی بھائیوں کا حق بھی چھین لینا چاہتے تھے چونکہ فریزر احمد بخش خاں کے گہرے دوست تھے اس لئے انہوں نے

شمس الدین خاں کو رو کا اور جب انھوں نے اعتنا نہ کی تو پھر علانیہ ان کے چھوٹے بھائیوں کی تائید کی اور ان کی زیادتیوں کا حال کلکتہ کو بھی لکھ دیا جس کی وجہ سے خفا ہو کر شمس الدین خاں نے فریزر کو قتل کرا دیا۔

چاہے پہلی روایت صحیح ہو یا دوسری مگر یہ ثابت ہے کہ شمس الدین خاں نے اپنے ملازم کریم خاں سے ولیم فریزر کو قتل کرا دیا اور اسی الزام میں انگریزوں نے ان پر سرسری مقدمہ چلا کر ۳ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو کشمیری دروازے کے قریب فوج کی نگرانی میں پھانسی دیدی، ونسنٹ اسمتھ کے حوالے سے میجر جنرل ایلین نے لکھا ہے کہ "نواب شمس الدین خاں نے پھانسی کے روز ہلکے سبز رنگ کا نہایت ہی مکلف لباس زیب تن کیا تھا مگر پھانسی کے وقت وہ لباس اتار دیا گیا تھا جس وقت پھانسی دی گئی اور لاش زمین پر لٹا دی گئی تو لاش خود بخود تڑپی اور قبلہ رو ہو گئی اور اسی حالت میں دم نکلا"

شمس الدین خاں کی موت سے ساری دِلّی متاثر ہوئی، دِلّی کی تمام مسجدوں میں غائبانہ نماز جنازہ پڑھی گئی اور خوب دل کھول کر ان کا ماتم کیا گیا اور ان کے سوتیلے بھائیوں نے فیروز پور جھرکہ اور ان کی ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا اس وقت داغ کی عمر چار سال چار مہینے نو روز کی تھی اور ان کی تسمیہ خوانی (بسم اللہ) کی تیاریاں ہو رہی تھیں، اس حادثہ کے بعد داغ کی والدہ بہت پریشان ہو گئیں اور انھوں نے داغ کو اپنی بڑی بہن عمدہ خانم کے پاس بھجوا دیا جو رامپور میں تھیں، رامپور پہنچ کر داغ نے مولوی غیاث الدین (صاحب غیاث اللغات) سے فارسی پڑھنی شروع کی عمدہ خانم چونکہ نواب رامپور کی متوسل تھیں اس لئے وہ کبھی دِلّی اور کبھی رامپور میں رہتی تھیں اور داغ بھی ان کے ساتھ ہی رہتے تھے۔

۱۸۴۴ء ۱۲۶۰ھ میں مرزا فخرو ولی عہد ولی نے داغ کی والدہ سے عقد نکاح کر لیا اور قلعہ معلی میں پہنچ گئیں تو انہوں نے داغ کو بھی اپنے پاس بلوا لیا، اس وقت داغ کی عمر بارہ تیرہ سال کی تھی، قلعہ میں پہنچنے کے بعد داغ کی تعلیم باقاعدہ شروع ہوئی مولوی سید احمد حسین ابن میر غلام حسین شکیبا نے درسی کتابیں پڑھائیں سید امیر پنجہ کش نے خطاطی سکھائی، مرزا عبداللہ بیگ نے بانک، مرزا انگی بیگ نے پھکیتی علی کی مشق کرائی، محمد خان و بندو خاں چابک سواران شاہی نے شہسواری سکھائی اور خود ولیعہد بہادر (مرزا فخرو) نے بندوق بازی، تیر اندازی، چوگان اور تیسا کاٹنا سکھایا۔

ان دنوں قلعہ میں شعر و شاعری کا چرچا تھا، داغ کی طبیعت بھی اس طرف مائل ہوگئی، اور انہوں نے بھی شعر کہنا شروع کیا، مرزا فخرو نے داغ کی موزوں طبیعی دیکھی تو استاد ذوق سے رجوع کرا دیا اور داغ نے باقاعدہ شاعری شروع کر دی، ان دنوں قلعہ سے باہر شہر میں مسلسل مشاعرے ہوا کرتے تھے، ذوق نے داغ کو بھی مشاعروں میں لے جانا شروع کیا۔ چنانچہ پہلا مشاعرہ جس میں داغ نے شرکت کی نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا مشاعرہ تھا جس میں داغ نے پہلی اور بڑی ہی دھوم کی غزل پڑھی جس کا مطلع تھا ؎

شرر و برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں　　　کس لئے پھر یہ ٹھہرتا دلِ بیتاب نہیں

دوسرا مشاعرہ "زینت باڑی" کا تھا جس میں داغ نے طرحی غزل پڑھی اور جب مقطع ؎

لگ گئی چپ تجھے اے داغِ حزیں کیوں ایسی　　　مجھ کو کچھ حال تو کم بخت بتا تو اپنا

پڑھا تو مولانا صہبائی نے اٹھ کر گلے سے لگا لیا۔

غالب کی غزل "دم نکلے"، "ہم نکلے" بہت مشہور ہوئی تو اسی طرح میں قلعہ میں بھی مشاعرہ ہوا، داغ نے عین مشاعرے کے وقت غزل کہی اور سرسری طور پر ذوق کو دکھا لیا اور مشاعرے میں پڑھی، جب اس شعر پر پہنچے ؎

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

تو شاہ ظفر نے داغ کو بلا کر پیشانی چوم لی،

نواب اصغر علی خاں نسیم کے مشاعرے میں داغ کو مومن اور ذوق کے درمیان جگہ ملی چونکہ ذوق استاد شاہ تھے اس لئے ہر مشاعرے میں سب سے آخر میں غزل پڑھا کرتے تھے، مومن کے بعد داغ کی باری آئی تو اپنی طرحی غزل کا رنگ جمنے کی امید نہ پاکر داغ نے طرح میں غزل نہ کہنے کا عذر کر دیا مگر ذوق نے غیر طرحی غزل پڑھنے کی اجازت دی اور داغ نے مطلع پڑھا ؎

عجب اپنا حال ہوتا جو وصال یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا

مطلع سن کر مومن، آرزو، صہبائی وغیرہ چونک اٹھے اور داغ کی غزل حاصل مشاعرہ رہی۔

۱۸۵۶ء / ۱۲۷۲ھ تک داغ قلعہ میں رنگ رلیاں کرتے رہے، اس سال مرزا فخرو کو زہر دیا گیا یا ہیضہ ہوا بہر حال بیمار رہے ولی عہد اللہ کو پیارے ہو گئے اور داغ کو قلعہ سے نکلنا پڑا، قلعہ سے نکل کر چند روز دلی میں رہے اور پھر رامپور چلے گئے چنانچہ ۷ اپریل ۱۸۵۶ء کو جب ظہیر دہلوی مع اپنے بھائی کے رامپور پہنچے

تو داغ نے ان کی آمد کی اطلاع پاکر ان سے ملاقات کی اور صاحبزادہ رضا محمد خاں (داماد یوسف علی خاں بہادر) سے سفارش کرکے انہیں نوکر بھی رکھا دیا، اس طرح داغ نے آٹھ سال گزارے رام پور سے انہیں مالی امداد ملتی رہتی تھی اور وہ کبھی دہلی اور کبھی رام پور میں رہتے تھے، ۱۴ اپریل ۱۸۶۶ء کو داغ کا تقرر زمرۂ مصاحبین میں ہوا اور کارخانہ جات (فراموش خانہ اصطبل وغیرہ) تفویض ہوئے۔

داغ پیدائشی شاعر تھے اور خدا نے انہیں شاعری ہی کے لئے پیدا کیا تھا یوں ان میں دوسرے کاموں کی بھی خاصی صلاحیت تھی اس لئے انہوں نے اپنی ملازمت کے لحاظ سے فرائض منصبی کو نہایت ہی محنت اور جاں فشانی سے انجام دینا شروع کیا اور ساتھ ہی ساتھ شاعری بھی جاری رہی، ان دنوں رامپور میں بڑے بڑے عالم فاضل، شاعر، صناع جمع ہوگئے تھے صرف شعراء میں حسب ذیل اساتذہ موجود تھے،

اسیر، امیر، جلال، ذکی، منیر (شکوہ آبادی) جان صاحب، منصور علی منصور رسا (رامپوری) نثار، غنی، عمیق، شاداں، بدر، بشیر، صبا (سہوانی)، شاغل، حیا، عروج اور تجرو وغیرہ۔

ہر ہفتہ مشاعرے ہوتے اور روزانہ ان شعراء سے مقابلے ہوا کرتے تھے جس کی وجہ سے داغ کی طبیعت نہ صرف منجھ گئی بلکہ چمک گئی اور داغ اسی زمانے میں استاد بنے،

خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر والئی رامپور بڑے جدت پسند اور فراخ دل رئیس تھے رامپور کو انہوں نے طرح طرح سے سنوارا نہ صرف علماء

فضلاء اور اہلِ کمال کو جمع کیا بلکہ شہر کی آرائش و زیبائش صنعت و حرفت اور تجارت
بڑھانے کی خاطر اپنی مسند نشینی (۱۸۶۵ء / ۱۲۸۲ھ) کے بعد ہی سے جدوجہد شروع کی چنانچہ
مارچ ۱۸۶۶ء میں بے نظیر کا میلہ شروع کرا دیا، یہ میلہ ماہ مارچ کے آخری ہفتے
میں شروع ہوتا اور ختم مہینے پر برخاست ہو جاتا تھا مگر کبھی کبھی اپریل کے پہلے ہفتے
تک توسیع بھی دی جاتی تھی۔

یہ میلا ایک باغ میں ہوتا تھا جس کا نام "باغ بے نظیر" تھا اس لئے اس
کا نام ہی بے نظیر ہو گیا، شہر رامپور سے تین میل کے فاصلے پر ایک کوٹھی ۱۲۳۲ھ میں
نواب احمد علی خاں نے بنوائی تھی اس کی تکمیل کے بعد ۱۲۳۳ھ میں اس کے
اطراف ایک پُر فضا باغ بھی بنوایا گیا جس کا نام بے نظیر رکھا گیا، جن دنوں میلا
شروع کیا گیا رامپور تک ریل نہ تھی بلکہ مراد آباد اسٹیشن سے اتر کر رامپور جانا پڑتا
تھا، مگر باوجود اس کے بمبئی، کلکتہ، دہلی، لکھنؤ اور دوسرے بڑے بڑے شہروں سے
بیوپاری میلے میں اپنا مال اسباب لاتے تھے خود نواب صاحب بھی ذاتی طور
پر مشاہیر کو دعوت دے کر دور دور سے بلایا کرتے تھے،

ایک جدت پسند اور حاضر دماغ شخص جس قدر اہتمام کر سکتا تھا اتنا اہتمام
میلے کا کیا جاتا تھا، تفریح اور دلچسپی کی بیسیوں چیزیں فراہم کر دی گئی تھیں۔
ایک طرف دوکانیں لگوائی جاتیں ایک طرف اکھاڑے بنائے جاتے جن
میں بنوٹ، سیف، بانک، پٹے وغیرہ کے مظاہرے ہوتے اور اکھاڑے والوں
کو انعام دیئے جاتے، چار بیت کہنے والوں کی ٹولیاں دن رات دف پر چار
بیت گاتیں، داستان گو ایک طرف بیٹھے داستان سنایا کرتے۔ مکانوں کے

لئے نفیس اور پُرتکلف خیمے اور ڈیرے دیئے جاتے امرا اور اہلِ ثروت ان میں آکر ٹھہرتے، فوج اور پولیس کا معقول انتظام ہوتا اور میلہ دیکھنے والوں کو ساری سہولتیں مہیا کی جاتی تھیں ۔

باغ کے بیچوں بیچ نہر بہتی تھی جس کے دونوں طرف دو مہتابیاں تھیں ایک مہتابی رقص و سرود کے لئے اور ایک نماز کے لئے مخصوص تھی، نماز کے اوقات میں رقص و سرود بالکل بند رہتا تھا، کلکتہ، دہلی، بنارس، لکھنؤ وغیرہ سے مشہور طوائفیں اور فن کار آتے اور اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے ۔

میلے کے مقام کے درمیانی حصے میں ایک عمارت قدم شریف کے لئے ۱۲۸۷ھ میں بنائی گئی تھی جس کی زیارت بڑی دھوم دھام اور عقیدت سے کی جاتی تھی، کوٹھی بدر منیر سے پنکھے کا جلوس بڑے ہی تزک و احتشام سے لایا جاتا تھا، بخلاف اور میلوں کے اس میلے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہاں نہ تو جوا ہوتا اور نہ شراب ہی، میلے کی آخری رات چراغاں ہوتے نہر میں بجرے پڑے ہوتے جن میں نواب صاحب بھی بیٹھتے اور انہیں میں رقص و سرود بھی ہوتا، آتش بازی چھوڑی جاتی ..... اور پانی میں لطف چراغاں دو بالا ہو جاتا ۔

پنکھے کا جلوس میلے کے آخری روز بڑی دھوم سے نکلتا بالکل فوجی ٹھاٹھ ہوتے شتر سوار، گھوڑے سوار، پھر پیدل فوج، نوبت نقارہ کے ساتھ ہاتھی پر جڑاؤ پنکھا نعت و صلواۃ کی گونج میں جلوس کے ساتھ لے جایا جاتا، ریاست کی ساری فوج مع اپنے اعزازات و لوازمات کے گزرتی اراکین و اعیانِ سلطنت جلوس کے ساتھ پیدل چلتے اور تماشائی دو طرفہ صف باندھے مؤدب کھڑے رہتے

میلے کی آخری رات شبِ جشن ہوتی جو بڑی اہم ہوتی تھی، باغ کی روش روش اور تختے تختے پر روشنی کی ٹٹیاں لگائی جاتیں، ان ٹٹیوں پر لال ہرے رنگ برنگ کے کاغذ اور ابرک کے قمقمے اور کنول روشن کئے جاتے جن کا عکس نہر کے پانی میں پڑ کر نہر میں آگ سی لگا دیتا، نہر میں شاہی بجرا کھڑا ہوتا، بجرے کی شہ نشین پر مخمل کار چوبی شامیانہ تنا ہوتا اور اس کے نیچے کار چوبی مسند بچھائی جاتی جس پر گاؤ تکیہ لگایا جاتا رنگا رنگی قمقموں سے بجرا بقعۂ نور بنا ہوتا نواب صاحب رات کے دس بجے بجرے پر سوار ہوتے نہر کے دونوں کناروں پر قطار باندھے ہندوستان بھر کے گوئیے طوائفیں اور باکمال موسیقار ٹھہرتے، نواب صاحب کے بجرے میں بیٹھتے ہی رقص و غنا شروع ہوتا اور بارہ بجے رات تک بجرا نہر میں ادھر سے اُدھر اُدھر سے ادھر گھومتا رہتا اور نہر کے دونوں جانب رقص و نغمہ ہوتا رہتا یہ جنت نگاہ اور فردوس گوش منظر جب بارہ بجے ختم ہوتا تو آتش بازی جلائی جاتی ٹٹیاں، چکر، تلے اور کوٹھیاں جو نہر کے دونوں طرف لگتے جاتے، روشن کئے جاتے اور آب و آتش بہم دست و گریباں ہو جاتے،

نواب صاحب رام پور نے بڑے بڑے فن دانوں کو جمع کیا تھا، وارو غہ محبوب جان، لذت بخش، جنو، ممی، اللہ رکھی، تقسی، کلکتہ والی، عباسی، عزیزن، گنگا جا، ہندی بان، امیر جان، امانی جان، بجادی لکھنؤ والی، اور جمیو درباری طوائفیں تھیں، امیر خاں (بین کار)، بہادر حسین (خاندان تان سین سے) باقر علی قوال، مودو پکھاوجی، حیدر بخش سارنگیا، جسو خان، رتیا، الو خانی گوئیے، رحیم اللہ خاں اور عظیم اللہ خاں طبلچی، کاظم علی خاں قوال، چندا خاں طبلچی، مندو ور سرنگیا، نثار علی اور امیر علی شہنائی

نوازنے خان معشوق ساز، مراد علی خاں اور علی جان نچکیا (رقاص) بڑے فنکار تھے میلے میں یہ سب شریک ہوتے اور ان کے علاوہ ہندوستان بھر کے گویّے اور طوائفیں آجاتیں، اس طرح یہ میلا بائیس سال تک بڑی دھوم دھام سے ہوتا رہا، آخری میلا خلد آشیاں نے شروع ہی کرایا تھا کہ ۲۲ رمارچ ۱۸۶۵ء کو اللہ کو پیارے ہوگئے، مگر ان کے لائق جانشین نواب مشتاق علی خاں (عرش آشیاں) نے میلہ ملتوی نہ ہونے دیا اور ۲۹ رمارچ کو جشن میں شرکت کی۔

نواب مشتاق علی خاں نے بھی دو سال تک میلا جاری رکھا اور پھر کونسل آف ریجنسی کے زمانے میں بھی چند سال تک جاری رہا، مگر بجائے باغ بے نظیر کے گنیش گھاٹ پر ہوتا رہا اور بے نظیر ہی کے نام سے موسوم رہا، اس کے بعد چند سال تک میلا بند رہا بالآخر نواب رضا علی خان بہادر نے ۱۹۴۲ء میں اس میلے کو نمائش کے نام سے جاری کیا جو اب تک جاری ہے۔

غالبؔ کو بے نظیر کے میلے میں شریک نہ ہونے کا افسوس رہا چنانچہ انھوں نے ۱۴ اپریل ۱۸۶۶ء کو بے نظیر کے میلے کے انعقاد کا اشتہار اخبار میں پڑھ کر نواب صاحب رامپور کو ایک عریضہ بھجوایا ہے جس میں میلے کی تاریخ بھی ہے چونکہ یہ عریضہ دلچسپ ہے اس لئے نقل کیا جاتا ہے۔

"نمائش گاہ سراسر سرور رامپور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں اور خونِ جگر کھاتا ہوں کہ ہائے میں وہاں نہیں، بالاخانے پر رہتا ہوں اتر نہیں سکتا مانا کہ آدمیوں نے گود میں سے کر اُتارا اور پالکی میں بٹھا دیا کہار چلے۔ میں نے مرا رامپور پہنچ گیا، کہاروں نے جاکر بے نظیر میں میری پالکی رکھ دی، پالکی قفس اور میں طائرِ اسیر

ہاں میں بے پر و بال نہ چل سکوں نہ پھر سکوں جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں یہ سب بطریق فرض محال ہے ورنہ ان امور کے وقوع کا کہاں مجال ہے۔ ہاں یہ تین بیت کا قطعۂ تاریخ بھیجتا ہوں اگر پسند آئے تو میں خوشنودی مزاج مبارک سے اطلاع پاؤں۔

نمائش گہے در خور شان خویش — بر آراست نواب عالی جناب
بہ بیں چو طرب را نہایت نماند — بود سال آں بخشش بے حساب
خدایا پسندد خداوندگار — کہ از طبع غالب رود پیچ و تاب

بخشش بے حساب کے ۱۲۸۵ ہوتے ہیں بائے موحدہ ہے جب وہ نہ رہی تو دو عدد گھٹے اور ۱۲۸۳ رہ گئے مدعا المراد اگر حضرت کی مرضی ہو تو دبدبۂ سکندری میں یہ تاریخ چھپوائی جائے۔"

تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

۴ اپریل ۱۸۶۶ء دیدار کا طالب غالب

امیر مینائی چونکہ رامپور ہی میں رہتے تھے اس لئے وہ بھی میلے میں شریک رہتے تھے اور انہوں نے بھی میلے سے دلچسپی لی ہے چنانچہ اس قسم کے شعر ان کے دیوان میں ملتے ہیں ؂

امیر جائیں گے ہم بے نظیر آج ضرور — خبر ہے میلے میں اس مہ لقا کے آنے کی

مشہور تخلص گو جان صاحب نے "مسدس بے نظیر" کے نام سے ایک نفیس مسدس لکھی ہے جو میلے کی تمام تفصیلات پر حاوی ہے اس مسدس کو بڑی عمدگی اور محنت سے ایڈٹ کر کے میرے مخلص میر محمد علی خاں صاحب اثر رامپوری نے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا ہے جو اس میلے کی بولتی چالتی تصویر ہے، مگر بائیس سال تک مسلسل میلا لگ کر

خلد آشیاں اُسے اتنا مشہور نہ کر سکے اور نہ مسدس کہہ کر جانؔ صاحب اتنی شہرت دے سکے جتنی کہ داغؔ نے اس میلے کو لافانی شہرت دی، کیوں کہ داغؔ نے اسی میلے سے عاشقی شروع کی اور پھر اپنی بے نظیر مثنوی فریادِ داغؔ میں میلے کی تفصیل بیان کی ہے۔ مارچ ۱۸۸۱ء میں جو میلا ہوا تو داغؔ اس میلے میں کس طرح کھو گئے انہیں کی زبان سے سنئے! ؎

آ گیا بے نظیر کا میلا — دل پابندِ وضع کھل کھیلا
آفتِ جانِ ناتواں دیکھی — یک بیک مرگِ ناگہاں دیکھی
جلوہ دیکھا جو حورِ طلعت کا — سامنا ہو گیا قیامت کا
دیکھ کر اس پری شمائل کو — رہ گیا تھام تھام کر دل کو
دل کو میں ڈھونڈھتا رہا نہ ملا — آنکھ ملتے ہی پھر پتا نہ ملا

اس طرح داغؔ نے عاشقی شروع کی اور بڑی ہی آسانی سے حجاب کو بھی ہموار کر لیا اور ؎

رات کٹتی ہنسی خوشی کیا کیا — ہوتی رہتی تھی دل لگی کیا کیا
جاں نوازی پہ اس کو ناز بھی تھا — بے نیازی میں کچھ نیاز بھی تھا
خانۂ دوست عیش خانہ تھا — ہائے کیا دن تھے کیا زمانہ تھا

عین وصل میں آہوئے وحشی بھڑک گیا ؎

آ گئی ہجر کی گھڑی سر پر — یہ بلا جھیلنی پڑی سر پر
اس کے لب پر پیامِ رخصت کا — میرے دل میں مقامِ حسرت کا
قصد ٹھہرا وطن کے جانے کا — رنگ بدلا نیا زمانے کا

.... — ....

ادھر اس میہماں کی رخصت　　　تھی ادھر میری جان کی رخصت
ساتھ اس کے مری نگاہ گئی　　　جب نگہ تھک گئی تو آہ گئی

اس طرح یہ عاشقی شروع ہوئی اور بی منی جان حجاب داغ کے دل پر جدائی کا داغ دے کر کلکتہ چلی گئیں، دوسرے سال ۱۸۸۲ء کے میلے میں بھی داغ نے بڑی منت خوشامد سے حجاب کو رامپور بلوایا ؎

جا کے عہد شباب کا آنا　　　تھا دوبارہ حجاب کا آنا
....　　　..................
پھر وہی ساعت سعید آئی　　　کہ برس دن کے بعد عید آئی

اس مرتبہ لوگوں نے دراندازیاں کیں اور حجاب کو داغ سے بھڑکایا دس پندرہ روز تک علیحدہ رہے مگر پھر صفائی ہو گئی اور ؎

گزری اوقات عیش و عشرت سے　　　دو مہینے تک ایک صورت سے

مگر حجاب کا دل جلد بھر گیا اور وہ واپسی کے لئے تیار ہو گئیں ؎

ہوسے میری بلا قفس میں رہے　　　آدمی کیوں پرائے بس میں رہے
قید خانہ ہے رام پور مجھے　　　جلد رخصت کریں حضور مجھے

اور پھر ؎

دم دلاسے وہ مجھ کو دے کے گئے　　　مجھ سے آنے کا وعدے کے گئے

داغ کی قسمت سے کلکتہ میں بھی حجاب کو بھڑکانے والے پیدا ہو گئے اور انہوں نے شہ دی کہ داغ کو کلکتہ بلائیں چنانچہ حجاب نے داغ کو کلکتہ بلوایا ؎

رسم الفت نباہتے ہو اگر　　　جان کی خیر چاہتے ہو اگر

اُٹھ کے سیدھے اِدھر چلے آؤ　　کوئی روکے گر چلے آؤ

مجبوراً داغ نے رخصت لی اور ؎

مل گئی جب حضور سے رخصت　　ہیں ہُوا رام پور سے رخصت
کہہ کے اٹھا اخیر یا قسمت　　راہ رو ہیں تو رہنما قسمت

رام پور سے داغ سیدھے دہلی گئے ؎

جا کے اپنے وطن میں جی نہ لگا　　اس بنائے کہن میں جی نہ لگا
چل کے دِلّی سے لکھنؤ پہنچا　　ہمہ تن شوق و آرزو پہنچا

لکھنؤ میں نواب سید بہادر حسین انجم نیشا پوری سے جو داغ کے دوست شاگرد اور رازدار بھی تھے انہوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا ؎

بہت اجڑے ہوئے مکاں دیکھے　　مٹنے والوں کے کچھ نشاں دیکھے
جو کچھ ارمان تھا نکال لیا　　شہر کو خوب دیکھ بھال لیا
خوب انجم نے میہمانی کی　　اور بھی سب نے مہربانی کی
راہ میں کانپور الہ آباد　　میں نے دیکھے مگر نہ حسب مراد
اتنے میں آ گیا عظیم آباد　　تھا مجھے اس کا شوق حد سے زیاد

عظیم آباد میں داغ کا خیر مقدم بڑی دھوم دھام سے ہُوا ؎

پیشوائی کے واسطے احباب　　آئے تھے شوق دید میں بیتاب
بہت اشخاص یک بیک آئے　　اپنی اپنی سواریاں لائے
کوئی مجھ کو لئے ہی جاتا تھا　　کوئی ناحق کا حق جتاتا تھا
کوئی کہتا تھا میرے گھر چلئے　　آئیے اس طرف اِدھر چلئے

بوئی لوگوں کی چپقلش کیا کیا　　رہی آپس میں کش مکش کیا کیا
مجھ کو یہ فکر تھی کہ بیٹھ چھٹے　　میرزا شاغل آئے تب وہ ہٹے

مرزا شاغل آغا تراب علی کے بیٹے اور داغ کے اخیافی بھائی تھے ابتدا رامپور میں رہے پھر عظیم آباد میں قیام کیا ان دنوں شاغل کی مستقل سکونت وہیں تھی اور انہوں نے ہی داغ کی میزبانی کی تھی چونکہ ان کے مسکونہ مکان میں گنجائش کم تھی اس لئے داغ کو اپنے دوست میر باقر کے مکان میں ٹھہرایا،

داغ عظیم آباد میں بہت مقبول تھے۔ ایک تو یوں ہی ان کی شہرت وہاں تھی دوسری وجہ یہ تھی کہ مرزا شاغل وہاں داغ کا پرچار کرتے رہتے تھے، شاعری کے ساتھ ساتھ انہیں شطرنج کا بھی شوق تھا عظیم آباد میں گرہٹہ میں میر محمد باقر کے مکان کے قریب رہتے تھے، میر باقر عظیم آباد کے قدیم خاندانی بزرگ تھے شعر بھی کہتے تھے اور وحید الہ آبادی سے تلمذ تھا، شعر و سخن اور شطرنج کے شوقین تھے اسی اتحادِ مذاق نے شاغل سے مراسم بڑھا دیئے تھے اور اتنی یک جہتی ہو گئی تھی کہ میر باقر ہی کے مکان پر دن بھر نشست رہتی تھی، داغ نے کلکتہ جاتے ہوئے عظیم آباد ٹھہرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو مرزا شاغل نے ان کی آمد کی خوب تشہیر کی اور سارے عظیم آباد میں شہرت دی کہ داغ آ رہے ہیں اسی لئے لوگ جوق در جوق اسٹیشن پہنچ گئے اور بیشتر رئیس اپنی اپنی سواریاں لے کر پہنچے تاکہ داغ کو اپنا مہمان بنائیں اور ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ داغ اس کے مہمان ہوں مگر داغ نے کسی کی مہمانی قبول نہیں کی اور مرزا شاغل نے سب لوگوں کو سمجھا منا کر داغ کو اپنے ساتھ لا کر گرہٹہ میں میر باقر کے مکان پر ٹھہرایا،

داغ کے عظیم آباد پہنچنے سے پہلے ہی وہاں کے محلہ مغل پورہ کے ایک رئیس

نے مشاعرہ مقرر کر دیا اور طرح دے دی تھی ۔

آباد کبھی خانہ ویراں نہیں دیکھا

اتفاق سے جس روز داغ پہنچتے ہیں اسی رات مشاعرہ تھا، بانئ مشاعرہ خود سواری لے کر داغ کے پاس پہنچے یا تو یہ اتفاق تھا، یا وہ داغ کا امتحان لینا چاہتے تھے۔ بہرحال انہوں نے مشاعرے میں چلنے کے لئے اصرار کیا اور داغ نے ان کے سامنے بیس پچیس شعر کہہ لئے اور راستہ چلتے چلتے دس بارہ شعر اور کہہ ڈالے اور مشاعرے میں بڑی سیر غزل پڑھی جس کا مطلع اور مقطع تھا ؎

اس خانۂ دل کو کبھی ویراں نہیں دیکھا   اس بت کو کب اللہ کا مہماں نہیں دیکھا

کیا پوچھتے ہو کون ہے کس کی ہے یہ شہرت   کیا تم نے کبھی داغ کا دیوان نہیں دیکھا

داغ کے خیر مقدم میں پہلا مشاعرہ میر باقر نے کیا اور اپنے استاد کی غزل کا مصرع طرح کر دیا، اس مشاعرے میں طرحی غزل سے پہلے داغ نے ایک غیر طرحی غزل پڑھی جس کے دو مطلعے یہ تھے ؎

فرقت کی شب یہ کام لیا دل کے داغ سے   ڈھونڈا اجل کو تا بہ سحر اس چراغ سے

کھاتے ہیں داغ دوست کیے دل کے داغ سے   سچ ہے چراغ ہوتا ہے روشن چراغ سے

طرحی غزل میں تو داغ نے دھوم مچا دی خصوصاً جب یہ شعر پڑھا تو سارا مشاعرہ تحسین و آفرین کے نعروں سے گونج اٹھا اور دس دس بار لوگوں نے پڑھوایا ؎

بہت رویا ہوں میں جب سے یہ میں نے خواب دیکھا ہے
کہ آپ آنسو بہاتے سامنے دشمن کے بیٹھے ہیں

ایک اور مشاعرہ عظیم آباد والوں نے داغ کے خیر مقدم میں کیا جس میں طرحی غزل داغ نے پڑھی اس کا مطلع کہا ہے

طور کے پہلو میں اک بت خانہ ایسا چاہیے ۔ شور لے اٹھے جلوۂ جانانہ ایسا چاہیے

داغ کے پہنچتے ہی میر باقر کا مکان تماشا گاہ بن گیا سارا عظیم آباد اُمڈ آیا ہر شخص آکر ملتا کوئی غزل سنتا کوئی غزل سناتا کوئی شاگرد ہوتا کوئی دوستی کا دم بھرتا، اس طرح داغ عظیم آباد میں بہت مقبول اور مصروف رہے، خاص خاص لوگ جو ملنے آتے تو داغ بھی بازدید کے لئے ان کے پاس جاتے تھے چنانچہ اسی سلسلہ میں خانقاہ ابو العلائیہ محلہ شاہ امل کے سجادہ نشین، شاہ یحییٰ صاحب کی خدمت میں بھی حاضری دی، شاہ صاحب کو تاریخ گوئی کا شوق تھا۔ ہر واقعہ کی تاریخ کہا کرتے تھے۔ چنانچہ داغ کی آمد کی تاریخیں بھی کہیں ؎

جناب داغ در شہر من آمد ۔ رسیدند آرزو مندان ز ہر سو
بہ لوح دہر تاریخ قدومش ۔ رقم کردم قدوم داغ حق گو

سنہ ۱۲۹۹ (۱۸۸۲ء)

دیگر

جناب داغ عالیجاہ آمد در عظیم آباد ۔ مثال گل بہار افزائے دل چو ماہ نور افشاں
ہمیں تاریخ مصرع از درون من بروں آمد ۔ رسیدہ مرہم دلہائے رنجوراں انیس جاں

سنہ ۱۲۹۹

دیگر

یکتائے زمانہ داغ خوش خو ۔ در ملک سخنوری بود شاہ
در وصف کمال آں سخنور ۔ دامان دراز نظم کوتاہ

امروز بہ ارض ہند مثلش	بنود یک فرد بعلم اللہ
در پٹنہ برائے سیر آمد	نور افشاں نور پاش چو ماہ
شد جلیع نیاز مند مسرور	از دیدن آں یگانہ دلخواہ
تاریخ قدوم اگر بپرسند	گو، مقدم داغ صاحب آہ!

سنہ ۱۲۹۹ھ

عظیم آباد والوں نے جس گرم جوشی سے داغ کا استقبال کیا اور جس خلوص محبت سے خوش آمدید کہا اس سے داغ بہت متاثر ہوئے، کیوں کہ اس وقت تک داغ کو اتنی ہر دل عزیزی نصیب نہیں ہوئی تھی، یہ دراصل مرزا شاغل اور ان کی پارٹی کا اہتمام تھا جو داغ اتنے مقبول ہوئے اس کا ذکر مثنوی میں داغ نے اس طرح کیا ہے ؎

مجھ کو فرصت ملی نہ یاروں سے	روز ملتا تھا میں ہزاروں سے
ایسی خلقت کہیں نہیں دیکھی	یہ مروت کہیں نہیں دیکھی
کیسی مہماں نوازیاں دیکھیں	کس قدر جاں نوازیاں دیکھیں
ان کے اخلاق یاد ہیں مجھ کو	اُن کے اشفاق یاد ہیں مجھ کو
دیں وہ مہماں کو جس قدر چاہیں	بخش دیں گھر کا گھر اگر چاہیں
میر باقر کے گھر قیام ہوا	خوب عزت کا اہتمام ہوا

قرائن یہ بتاتے ہیں کہ داغ اوائل اپریل میں رامپور سے نکل کر دہلی لکھنؤ وغیرہ گھومتے ہوئے اواخر اپریل سنہ ۱۸۸۲ء میں عظیم آباد پہنچے ہیں کیوں کہ انہوں نے ۷ رمئی سنہ ۱۸۸۲ء کو عظیم آباد سے نواب بہادر علی خاں انجم نیشاپوری

کو ایک خط لکھا ہے جس میں لکھتے ہیں۔

میں بخیر و عافیت وارد عظیم آباد ہوا، محلہ گزری باغ مکان سید باقر مرحوم میں مقیم ہوں، چار روز ہوئے کہ وہ کلکتہ روانہ ہو گئے۔ سید قطب الدین کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں .... اہلِ عظیم آباد نے میری اس قدر خاطر و عزت کی ہے جس کی حد نہیں۔ کلکتے نہیں جانے دیتے میری طبیعت علیل سرکار میں خط بھیجا ہے ان کے جواب کا منتظر ہوں۔

اس خط سے ظاہر ہے کہ داغ کے جنہیں "وہ" لکھا ہے اور جن کے ساتھ قطب الدین گئے، ۱۰ مئی ۱۸۸۲ء کو پٹنہ سے کلکتہ گئے، چوں کہ "وہ" داغ کے ساتھ ہی ساتھ عظیم آباد پہنچے تھے اس لئے یقین ہے کہ اواخر ماہ اپریل ہی میں یہ لوگ پٹنہ پہنچے ہیں۔

داغ نے یکم جون ۱۸۸۲ء کو ایک عرضی نواب صاحب رامپور کی خدمت میں بھیجی ہے کہ،

فدوی بضرورت چند در چند از ہفتہ وارد عظیم آباد پٹنہ گشتہ است و از اں جا قصد کلکتہ نیز می دارد۔ لہٰذا امید وارم کہ از راہ غریب نوازی رخصت دو ماہ دیگر مرحمت شود۔

اس خط کو دیکھ کر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ یہ خط جون کا نہیں بلکہ ماہ مئی کا لکھا ہوا ہے نقل کرتے ہوئے مہینہ غلط لکھا گیا ہے یا پھر ماہ جون صحیح ہو تو یہ ہو سکتا ہے کہ "بضرورت چند در چند از ہفتہ" والی عبارت کی نقل میں نقل نویس نے غلطی کی ہو کیوں کہ داغ کا قیام ایک مہینے کا ہو چکا تھا پھر داغ نے یہ مدت

کیوں گھٹا دی ممکن ہے کہ بصر درت "چند از چند ہفتہ" کو نقل نویس نے "چند از چند" لکھ دیا ہو مگر اس کی تصدیق مثنوی کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے ؎

آٹھ دن سیر و یکھی پٹنے کی   یہ ہوئی وجہ جی اچٹنے کی

۷ مئی کو داغ نے انجم بیشا پوری کے نام جو خط لکھا ہے اس کا آخری فقرہ ہے "سرکار میں خط بھیجا ہے ان کے جواب کا منتظر ہوں" اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ داغ نے مئی ہی میں نواب صاحب کو خط لکھا ہے، علاوہ ازیں داغ نے اپنی لکھوائی ہوئی سوانح عمری "جلوۂ داغ" میں بھی:

"اثنائے سفر میں آٹھ روز پٹنے عظیم آباد میں بھی مقیم رہے۔"

لکھوایا ہے، اس طرح داغ کے قیام پٹنہ کی مدت مشکوک ہو جاتی ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ داغ مئی میں عظیم آباد پہنچتے ہیں اور وہیں پر رہ کر ساون کا انتظار کرتے ہیں چنانچہ مشاعرے میں انہوں نے مقطع بھی پڑھا تھا ؎

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلا جائیں   عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

عظیم آباد کی گرمی کا ذکر مثنوی میں اس طرح کیا ہے ؎

کیا قیامت تھی شہر کی گرمی   کاش گنگا میں ڈوبتی گرمی
آگ کی طرح آب میں گرمی   مثل اخگر حباب میں گرمی
طبع گرمی سے کیوں نہ ہو عاری   جائے نوری وہاں تو ہو ناری
بے جلے کوئی استخواں نہ رہے   عنصر آب کا نشاں نہ رہے
رنگ جل جل کے ہو گئے کاجل   بھن گئے لے چلے جو گنگا جل
شعلہ زن ہو تنور طوفاں بھی   کانپتا ہے یہاں زمستاں بھی

رنگت آتش تپش سے زرد ہوئی   گرمی طبع داغ سرد ہوئی

صوبہ بہار میں ماہ جون کے وسط میں مان سون شروع ہوتا ہے اور جون کے بعد
مان سون شروع ہوا اور چھینٹا پڑا یعنی ساون رت آئی تو داغ نے کلکتہ کا قصد کیا۔
اس لئے یقین ہے کہ داغ نے پورا ماہ مئی اور آدھا ماہ جون عظیم آباد میں گزارا
ہے اور وسط ماہ جون میں کلکتہ روانہ ہوئے ہیں چنانچہ اس کا حال یوں بیان
کیا ہے ؎

سوئے کلکتہ میں روانہ ہوا   دور تک ساتھ اک زمانہ ہوا
شوق بے اختیار لے ہی گیا   یہ دل بے قرار لے ہی گیا
ایسی آئی ہوائے کلکتہ   دل پکارا کہ ہائے کلکتہ

کلکتہ پہنچ کر داغ کے "دوست" اور شاگرد رشید سید قطب الدین آشک نے داغ
کی آمد کی تشہیر کر دی تھی اس لئے خوب دھوم دھام کا استقبال ہوا ؎

ریل پر دوستان نیک خصال   آئے اکثر برائے استقبال
شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا   داغ آیا تو باغ باغ آیا

داغ کا یہ سفر کلکتہ پہلا نہیں تھا اس سے پہلے نواب صاحب رامپور کے ہمراہ
وہ کلکتہ جا چکے تھے مگر پھر بھی اپنی مثنوی میں کلکتہ کا ذکر اس طرح کیا ہے جیسے
کہ پہلی بار دیکھا ہو ؎

دیکھ کر شہر کھل گئیں آنکھیں   ماہ رویوں پہ ڈبل گئیں آنکھیں
سر بازار وہ مکان بلند   جس کو کہئے اک آسمان بلند
چرخ کو رتبہ اس مکان سے کہاں   دور بھاگا ہے یہ کہاں سے کہاں

شرم و غیرت سے چھٹ گئی جنت　　ورنہ یہ قصر و بہشتی جنت

کلکتہ میں اپنی قیام گاہ کی تعریف یوں کی ہے ۔

ہم جو بالائے بام رہتے تھے　　لوگ عالی مقام کہتے تھے
سامنے ناخدا کی مسجد تھی　　ناخدا کیا خدا کی مسجد تھی

"داغ نرے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک سیاست داں اور زمانہ شناس آدمی تھے بظاہر یہ سفر انہوں نے بہ سلسلۂ عشق و عاشقی کیا تھا مگر وہ اس کو وسیلۂ ظفر بھی بنانا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے ابتداً مرزا شاغل کو اپنی آمد کی اطلاع دے کر عظیم آباد میں اپنی آمد کی تشہیر کرائی اور مشاغل نے بھی وہ پروپیگنڈا اور پبلسٹی کی کہ نہایت شاندار استقبال ہوا اور عظیم آباد میں داغ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ داغ نے اپنے شاگرد سید قطب الدین اشک اور چند دوسرے احباب کو کلکتہ بھجوا دیا کہ وہاں پہنچ کر زمین ہموار کریں اور ان کا استقبال خاطر خواہ ہو سکے چنانچہ ایسا ہی ہوا، مگر کلکتہ بڑا شہر تھا شعر پسند طبقہ کم اور کاروباری لوگ زیادہ تھے اس لئے وہاں عظیم آباد کی طرح ہنگامہ تو نہ ہو سکا، مگر استقبال نہایت ہی شاندار ہوا اور داغ کے لوگوں نے جو مکان ناخدا کی مسجد کے سامنے کرایہ پر لیا تھا اس میں قیام ہوا۔"

ماہنامہ نگار لکھنؤ کے داغ نمبر میں اور اس کے بعد کے پرچوں میں دو ایک مضامین داغ کے سفر عظیم آباد کے متعلق طبع ہوئے ہیں جن سے ہمیں تاریخی قطعات خیر مقدم مل سکے مگر داغ کے سفر کلکتہ اور قیام کلکتہ سے متعلق کچھ مواد ہی مل سکا مثنوی فریاد داغ کے علاوہ چند سطریں "جلوۂ داغ" میں ملتی ہیں اور کچھ نہیں جلوۂ

داغ کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

"کلکتہ میں ناخدا کی مسجد کے سامنے آپ (داغ) ٹھہرے تھے اور جب
تک وہاں رہے برابر مشاعرے ہوتے رہے، مشاعرہ تو لوگوں نے آپ ہی کے
مکان پر کیا تھا جس میں مٹیا برج کا خاندانِ شاہی اور بہت سے ملازمین و عائدین
خاندانِ شاہی محض آپ کی خاطر سے شریک ہوئے اور اسی طرح مختلف مقامات
شہر میں مشاعرے ہوا کئے، برابر آپ کے قیام تک وہاں یہی کیفیت رہی کہ روزانہ
صبح و شام بیسیوں اور سینکڑوں نئے مشتاق رؤسا اور عائدین آپ سے ملنے کیلئے آتے تھے"

داغ نے جلوۂ داغ میں اپنی ایک بدحواسی بھی لکھوا دی ہے کہ عبدالرزاق شاد
نے مشاعرہ کیا اور نہ تو پہلے سے دعوت دی اور نہ ہی طرح بھجوائی بلکہ مشاعرے ہی کی رات
داغ کے پاس پہنچ کر مشاعرے میں چلنے کے لئے مجبور کیا اور داغ نے بھی شاد کے ساتھ جا کر
مشاعرے میں شرکت کی چونکہ داغ نے طرح میں غزل نہیں کہی تھی اس لئے انہوں نے
شاد سے خواہش کی کہ انہیں کسی علیحدہ کمرے میں غزل کہنے کے لئے ٹھہرایا جائے چنانچہ
شاد نے داغ کو ایک کمرے میں بٹھا دیا اور داغ غزل کہنے میں محو ہو گئے، اتفاق سے
پٹنے سے دو عدالتی عہدہ دار جو بزرگ صورت اور سفید لباس میں ملبوس تھے مشاعرے میں
پہنچے اور انہوں نے داغ کو ڈھونڈھا تو شاد نے انہیں اس کمرے میں پہنچا دیا جہاں داغ
بیٹھے غزل کہہ رہے تھے، یہ دونوں سفید پوش بزرگ داغ کے قریب پہنچ کر ان کی محویت
دیکھ رہے تھے کہ یکایک داغ چونکے اور ان کی نظر ان بزرگوں پر پڑی اور بے اختیار
ان کے منہ سے نکلا "ہیں! ابھی سے منکر نکیر کہاں سے آ گئے میں ابھی زندہ ہوں" داغ
کی اس بدحواسی پر دونوں بزرگ مسکراتے ہوئے مجلس مشاعرہ میں واپس چلے گئے۔

داغؔ کی غزل جس کا یہ شعر ہے کسی کلکتہ ہی کے طرحی مشاعرے کی ہے ؎

اک چشمۂ حیواں ہے تو اک چشمۂ کوثر　　دو قطرے ہیں آبِ دمِ شمشیر سے باہر

اور یہ شعر بھی داغؔ نے کلکتہ ہی کے کسی مشاعرے میں پڑھا تھا۔

یہ حسیں یہ مہ جبیں یہ شہر ایسی سیر ہر　　داغؔ کلکتے سے لاکھوں داغ دل پر لے چلا

داغؔ نے قیام کلکتہ کے زمانے میں ہزاروں آدمیوں سے ملاقات کی اور سینکڑوں آدمیوں سے دوستی کر لی چنانچہ کلکتہ سے واپس آنے کے بعد بھی بیشتر لوگوں سے داغؔ نے مراسلت باقی رکھی تھی چنانچہ انشائے داغؔ اور خطوطِ داغؔ میں بیسیوں خطوط کلکتہ والوں کے نام کے موجود ہیں، داغؔ نے کلکتہ والوں کی تعریف اس طرح کی ہے ؎

لوگ سب خوش قماش و خوش ترکیب　　اہل تمیز و صاحبِ تہذیب

ہم سے سرگرم اتحاد رہے　　عبدالرزاق شادؔ، شاد رہے

دوست بادضع ہے کہاں پیدا　　داغؔ اس وضع دار کا شیدا

شیخ عبدالرزاق شادؔ دہلوی شیخ اللہ دیا کے بیٹے تھے جنہیں کلکتہ کے مشہور اور متمول تاجر شیخ جیون بخش نے متبنّیٰ کیا تھا اور وہ لاہور کے مشہور سوداگر شیخ رحیم بخش کی صاحبزادی بیاہی گئی تھیں، ابتداً شادؔ اپنا کلام حکیم سید محمد سجاد کو دکھاتے رہے مگر داغؔ کلکتہ پہنچے تو انہوں نے بھی تلمذ حاصل کیا اور خوب خاطر مدارات کی ان سے ایسے گہرے مراسم ہو گئے تھے کہ یہ داغؔ کے حیدرآباد آنے کے بعد ان سے ملنے کے لئے حیدرآباد بھی آئے تھے۔

احسن مارہروی اور افتخار عالم مارہروی نے داغؔ کے قیام حیدرآباد کے زمانے میں چند سال تک داغؔ کا روزنامچہ لکھنا شروع کیا تھا اور تین چار سال کے واقعات لکھ لئے تھے اس کا مسودہ احسن صاحب کے مہ جبیں رفیق مارہروی نے بڑی کوشش سے فراہم

رکے مجھے بھی اسکی زیارت کا مستفع دیا جس کے لئے ان کا ممنون ہوں اس روزنامچے میں مرزا داغ کلکتہ سے متعلق ملتے ہیں۔

۲۱ر مارچ ۱۹۰۸ء کے روزنامچے میں لکھا ہے کہ "آج کی صحبت میں دیر تک مرزا صاحب (داغ) عشق صادق پر روشنی ڈالتے رہے اور عجیب عجیب انداز سے عشق حقیقی و مجازی کے فرق و امتیاز میں دلائل پیش فرماتے رہے، اس سلسلہ میں مرزا صاحب نے ایک عجیب واقعہ سنایا۔"

"انہوں نے فرمایا کہ میں کلکتہ میں ایک روز بیٹھا ہوا مکان کی کھڑکی سے بازار کی سیر کر رہا تھا رات کے آٹھ یا نو بجے تھے یکایک میرے کانوں میں گانے کی آواز آئی غور کیا تو ایک شخص میرا ہی ایک شعر نہایت دردناک آواز سے گاتا ہوا چلا آ رہا تھا، شعر یہ تھا۔

دنیا میں کوئی لطف کرے یا جفا کرے ۔۔۔ جب میں نہیں بلا سے مری کچھ ہوا کرے

گانے والے کی دردناک آواز اور پھر میرا ہی شعر میں اس درجہ متاثر ہوا کہ بے اختیار گانے والے کو آواز دی اور اشارہ کیا، پہلے تو اس نے حیران ہو کر مجھے دیکھا لیکن میرے دوسرے اشارے پر وہ میرے پاس چلا آیا، بیس بائیس برس کا نہایت خوب رو لڑکا تھا نام پوچھا تو احمد بتایا، میں نے پوچھا کس کا شعر پڑھتے ہوئے جا رہے ہو تو اس نے کہا داغ کا، میں نے پوچھا داغ کو تم نے دیکھا بھی ہے؟ کہا نہیں! میں نے کہا تم داغ کو دیکھنا چاہتے ہو؟ تو اس نے کہا آج سے پہلے تو ضرور داغ کو دیکھنے کی تمنا تھی لیکن اب صرف ایک تمنا ہے! میں نے پوچھا وہ کیا؟ لڑکا اس سوال پر گھبرا سا گیا جب بہت اصرار کیا تو کہا کہ اگر آپ مجھے صفیہ کو دکھا دیں تو تمام عمر آپکا احسان نہ بھولوں گا۔ یہ سن کر مجھے تعجب ہوا، پوچھا یہ صفیہ کون ہے؟ اس نے بتایا یہ صفیہ وہ ہے جس پر میں چار سال سے فریفتہ ہوں اور امید تھی کہ کسی نہ کسی روز اسے اپناؤں گا لیکن آج وہ خیال بھی خام ہو گیا اور اب اس کے ملنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی، کل اس کی شادی ہو گئی اب

میرا زندہ رہنا بیکار ہے " یہ کہہ کر وہ اٹھا اور جانے لگا میں نے روک کر کچھ اور حال دریافت کرنا چاہا لیکن وہ مجھ سے ہاتھ چھڑا کر یہ کہتا ہوا کہ مجھے چھوڑیئے مجھے معشوقہ کے پاس پہنچنے میں دیر ہوتی ہے، چل دیا اور پھر نہایت دردناک آواز گانے کی میرے کانوں میں آنے لگی "۔

۲۴ر جون ۱۹۰۸ء کے روزنامچے کی عبارت بھی ملاحظہ کیجئے :-

" آج رات مرزا صاحب نے ایک واقعہ سنایا کہ وہ ایک دفعہ ہگلی ندی میں ڈوبتے ڈوبتے بچے انہوں نے فرمایا کہ ایک ڈونگے میں ہم اور ہمارے دوست عبدالاحد اور حافظ محمد ابراہیم سوار تھے، ہم تینوں آدمی بہ اعتبار تن و توش ایک دوسرے کے مد مقابل تھے ڈونگے کو چلانے والا صرف ایک تھا۔ اتفاقاً دوسری طرف سے ایک اسٹیمر آیا وہ جب ہماری کشتی سے صرف پانچ گز کے فاصلے سے گیا تو اس کے دباؤ سے جو پانی کٹا اس نے ہمارے ڈونگے کی رفتار پہ اثر کیا، پانی کی لہروں نے ڈونگے کو ڈانواڈول کر دیا وہ کبھی ایک طرف اونچا ہو جاتا کبھی دوسری طرف، ہم تینوں کی بُری حالت تھی حافظ ابراہیم نے حزب البحر پڑھنا شروع کر دی، وہ نہایت بدآواز تھے اور خوف و دہشت نے ان کی آواز کو اور زیادہ بھیانک بنا دیا تھا، ان کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی، عبدالاحد مجھ پر خفا ہونے لگے " یہاں جان پر بنی ہے آپ کو ہنسی سوجھی ہے " میں نے ہنس کر کہا " بھائی موت تو اب ضرور آئی ہے ہنسنے اور تفریح کی حسرت دل میں کیوں رہ جائے " یہ کہہ کر میں نے حافظ صاحب سے کہا " ذرا زور سے اور جلد جلد پڑھو کہ نجات ہو جائے۔"

اس " ڈوبتی نیا " کے واقعے سے داغ کی خوش طبعی اور مستقل مزاجی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ کتنے قوی القلب اور زندہ دل تھے، داغ کی یہی مستقل مزاجی اور ہمت ان کی کامیابی اور

کامرانی کا باعث ہوئی،

داغ نے چونکہ ساون رُت شروع ہونے کے بعد کلکتہ کا قصد کیا تھا اس لئے وہ ساون کا لطف وہاں اٹھاتے رہے،

کالی کالی گھٹائیں آتی تھیں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں
آتشِ حسنِ یار کی گرمی بزم میں اک بہار کی گرمی
گرچہ اکثر ہوا جنوبی تھی پر وہ عطرِ حنا میں ڈوبی تھی
چاندنی کے تمام شب جلسے دلکشا سقف پر عجب جلوے
یاد ہے ایک رشکِ گل کی سیر چودھویں رات کو وہ پل کی سیر

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شعبان کی چودھویں رات کے چاند کی سیر داغ نے کلکتہ میں اپنی رشکِ گل کے ساتھ کی ہے، اور یہ رنگ رلیاں جاری ہی تھیں کہ رامپور سے طلبی ہوئی ؎

میری رخصت کے دن تمام ہوئے عیش و عشرت کے دن تمام ہوئے
جلد حاضر ہو یہ پیام آیا اور سر پر یہ صبح و شام آیا
پھر تو میں ایک دم ٹھہر نہ سکا دل کی صورت قدم ٹھہر نہ سکا
اس طرح کس طرح سے رہ جاتے ہوئے باون برس نمک کھاتے
دل خدا نے دیا غیور بہت تھا یہ پاسِ نمک سے دور بہت
گر نمک خوار حیلہ گر نکلے تو نمک پھوٹ پھوٹ کر نکلے

داغ کی عمر سفرِ کلکتہ کے زمانے میں باون سال ہو رہی تھی اس لئے انہوں نے اپنے آپ کو باون سالہ نمک خوار ظاہر کیا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ پیدائش سے سرکار رامپور کے نمک خوار نہیں بلکہ اپنی پانچ سالہ عمر سے رامپور کے نمک خوار تھے اس طرح نمک خواری

باون سالہ نہیں بلکہ (۴۷) سالہ تھی، یہ بے اعتدالی بھی عظیم آباد کے ایک ہفتہ قیام کی سی ہے۔

داغ نے ۶ اپریل ۱۸۸۲ء سے دو مہینے کی رخصت لی ہوگی جو ۵ جون کو ختم ہوتی تھی اس لئے انہوں نے یکم جون کو عظیم آباد سے "رخصت دو ماہ دیگر" کی درخواست بھجوائی "تار" معلوم ہوتا ہے کہ مزید دو مہینے کی رخصت منظور نہیں ہوئی بلکہ صرف ایک مہینے کی رخصت منظور ہوئی جو ۵ جولائی ۱۸۸۲ء کو ختم ہونے والی تھی، رامپور سے یہی اطلاع آئی ہوگی کہ آپ کی مزید ایک مہینے کی رخصت منظور ہوئی ہے جو ۵ جولائی کو ختم ہوجاتی ہے، ختم رخصت پر حاضر ہوجایئے، اس اطلاع سے پریشان ہوکر داغ نے جب حجاب سے واپسی کا ذکر کیا تو ؎

میری رخصت سے ان کو حیرت تھی	کہ یہ رخصت نہ تھی قیامت تھی
فکر تشویش رنج تھا غم تھا	عوض نغمہ شور ماتم تھا
اشک آنکھوں میں ڈبڈبائے ہوئے	پاس بیٹھے تو منہ بنائے ہوئے

انتہا یہ کہ حجاب نے یہاں تک کہا ؎

چند وابستہ ہیں ہمارے ساتھ	ورنہ ہو لیتے ہم تمہارے ساتھ
ہم عزیزوں کو چھوڑ دیں کیونکر	سلسلہ ان سے توڑ دیں کیونکر
جو مرے پاس ہے تمہارا ہے	چھوٹتا ہے یہ ساتھ غم یہ ہے

بہرحال بصد حسرت و یاس داغ نے ۲ جولائی ۱۸۸۲ء کو کلکتہ چھوڑا ؎

اہل صحبت کو داغ دے کے چلے	اپنے دل کا جنازہ لے کے چلے
کیا کہیں کس طرح سے ہم آئے	ہمہ تن حسرت و الم آئے

میرے ہمراہ میر قطب الدین   اشک ریزاں بحالت غمگین

میری غمخواریوں سے کام نہیں   میری دلداریوں سے کام نہیں

وہ مرے دل کو اس طرح لائے   کوئی گھائل کو جس طرح لائے

کچھ نہ تھی مجھ کو جسم و جاں کی خبر   نہ زمیں کی نہ آسماں کی خبر

ریل نے دو ہی دن میں پہنچایا   رمضان ایک دن کے بعد آیا

دست بستہ حضور میں پہنچا   بزم عیش و سرور میں پہنچا

جنتری دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸ جولائی ۱۸۸۲ء کو غرہ رمضان ۱۲۹۹ھ تھا اس لئے ہم نے یہ تعین کیا ہے کہ داغ ۴ جولائی کو کلکتہ سے چلے دو دن ریل میں رہے ۶ جولائی کو تین مہینے کے بعد بخیر و خوبی رامپور واپس ہوئے۔

رامپور پہنچ کر داغ کو قرار نہ آیا آتش فراق میں جلتے اور ہائے وائے کرتے رہے چنانچہ اسی حالت میں مثنوی لکھی اور یہ کہہ کر مثنوی ختم کی ہے ؎

یا الٰہی نجات غم سے ملے   وہ سراپا حجاب ہم سے ملے

ورنہ اس کا خیال بھی نہ رہے   اب رہے جیسا یہاں جی نہ رہے

اس طرح یہ (۸۳۸) شعر کی مثنوی داغ نے کہی جو ۱۸۸۲ء میں چھپی، یہ معلوم کر کے لوگوں کو حیرت ہوگی کہ یہ مثنوی داغ نے دو دن میں کہی ہے چنانچہ جلوۂ داغ میں احسن نے لکھوایا ہے،

"زود گوئی کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ فریاد داغ جیسی بے مثل مثنوی صرف دو دن کی معمولی فکر کا نتیجہ ہے"

داغ نے یقیناً دو دن میں مثنوی کہی ہوگی کیونکہ وہ بہت زود گو تھے حیدر آباد

میں باتیں کرتے کرتے دو دو دو تین تین غزلیں لکھوا دیا کرتے تھے ان کے لئے دن بھر میں چار سو شعر کہہ لینا دہ بھی مثنوی کی بحر میں کوئی مشکل نہ تھا،

مثنوی فریادِ داغ کو بہت ہی کم لوگوں نے پڑھنے کی کوشش کی ہے ۹۰ فی صد شیدائیان اردو مثنوی فریاد داغ کے نام سے واقف اور مختلف مقامات سے مثنوی کے نقل شدہ چند اشعار سے روشناس ضرور ہیں مگر کم لوگ ایسے ہیں جنہوں نے مثنوی کو شروع سے آخر تک پڑھا ہو۔ نقادوں میں شاید رام بابو سکسینہ (یا انکی کتاب کے مترجم مرزا محمد عسکری) ہی ہیں۔ جنہوں نے فریادِ داغ کا مطالعہ کیا ہے چنانچہ ان کا بیان ہے :-

"مثنوی فریادِ داغ میں اپنے عشق کا حال جو کلکتے کی ایک مشہور رنڈی منی بائی حجاب کے ساتھ ان کو تھا اور رامپور کا بے نظیر کا میلا دیکھنے کی غرض سے آئی تھی ایک شاعرانہ رنگ میں بیان کیا ہے اس مثنوی کے بہت سے اشعار اعلیٰ درجہ کے ہیں اور سادگی اور روانی و عمدگی ان کی قابلِ داد ہے علی الخصوص عاشق کا معشوق کی تصویر سے تخاطب نہایت دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے مگر بعض جگہ تفحیش اور خراب جذبات کی تصویریں متانت اور تہذیب سے گری ہوئی ہیں" (تاریخ ادبیات اُردو مولفہ سکسینہ مترجمہ عسکری مطبوعہ نولکشور صفحہ ۴۲۱)

سر عبدالقادر (لاہور) نے ایک انگریزی ماہنامے ہندوستان ریویو میں داغ پر ایک تفصیلی مضمون لکھا تھا جس کا ترجمہ ماہنامہ شمع آگرہ بابت ۱۹۲۶ء میں راقم الحروف نے شائع کیا ہے اس مضمون میں سر عبدالقادر نے فریادِ داغ پر بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی ہے،

فریاد داغ ایک مسلسل نظم یا مثنوی ہے جس میں داغ نے خود اپنی زندگی کا ایک واقعہ نظم کیا ہے یہ واقعہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب داغ ایک مغنیہ (طوائف) پر عاشق ہو جاتے ہیں جو صرف معمولی موسیقی کی ماہر ہی نہیں ہوتی بلکہ تعلیم یافتہ اور ادبی مذاق رکھنے والی بھی ہوتی ہے اور حجاب تخلص کرتی ہے اس مثنوی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ

دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی

اس میں کوئی بات عجیب و غریب اور غیر فطری نہیں ہے، ایک جلسہ رقص و سرود میں داغ اور حجاب ایک دوسرے سے بے حجاب ہو جاتے ہیں اور داغ اپنے دل پر اس کی مفارقت کا ایک دائمی نقش پاتے ہیں اس کی راگنی داغ نے فریاد کی لے میں الاپی ہے اور یہ راگ اس قدر صاف اور واضح طور پر الاپتے ہیں کہ کوئی شخص بھی سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا، وہ صاف طور پر اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ حجاب نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ ان کی سیہ فامی کے باوجود وہ ان کی شاعری کی مداح اور شیدا ہے چونکہ داغ نہ تو خوش رو تھے اور نہ نوجوان اس لئے کوئی نازنین ان کو محبت کی نظر سے کیوں دیکھتی، واقعہ یہ ہے کہ حجاب ان کی ظاہری شکل و شباہت پر نہیں بلکہ ان کی شاعری نام آوری اور دولت پر مٹی ہوگی مگر ان دونوں کی یکجائی بہت جلد ختم ہوگئی، کہا جاتا ہے کہ حجاب سن رسیدہ ہو جانے کے بعد داغ سے ملنے کے لئے آئی جبکہ داغ ستر (۷۰) برس کے ہو چکے تھے اس قصے کو اس نظر سے دیکھتے ہوئے میں نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی ایسی بات ہے جس پہ سوانح نگار کو شرمندہ ہونا پڑے، مثنوی جو اس قصے کو ظاہر کرتی ہے بڑی پر لطف ہے، داغ اس قصے کو اس سادگی سے بیان کرتے ہیں کہ دل لوٹ جاتا ہے ہر شعر حشر جذبات اور واردات قلبی کا نچوڑ ہے وہ اشعار جن میں داغ محبت کا اظہار کرتے

ہیں اس قدر پُر لطف ہیں کہ ان کے خلوص زور اور صداقت کے لحاظ سے مشکل ان کے
کسی معاصر کو یہ بات حاصل ہو سکتی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس مختصر مضمون میں فریادؔ کی شاعرانہ
خوبیوں کی تشریح پوری طرح کر سکتا ہوں۔ ان لوگوں کو جنہوں نے اس مثنوی کو اب
تک نہیں پڑھا ہے میں مشورہ دیتا ہوں کہ وہ ضرور پڑھیں اور اس کے محاسن کے
متعلق خود اپنی رائے قائم کریں۔ میری رائے میں اس مثنوی کا ادبی مقام بہت بلند
ہے اگرچہ داغؔ نے چار ضخیم دیوان چھوڑے ہیں مگر صرف یہ مثنوی ہی ان کے بقائے
دوام کے لئے کافی ہے۔"

ہندوستان اور پاکستان کے دو بڑے نقاد بابو سکسینہ اور سر عبدالقادر کی رائے
آپ نے دیکھ لی ایک "تاریخ ادبیات اردو" کے مصنف اور بڑے ماہر نقاد ہیں۔ دوسرے "شیخ"
زندہ دلانِ پنجاب "مخزن" جیسے بلند پایہ مجلے کے مدیر اور فاضل ادیب تھے ان دونوں کی
رائے کے بعد کسی اور کی رائے کی ضرورت نہیں۔

یہ تھی مثنوی فریادِ داغ کی مختصر روداد اور اس کی تشریح و توضیح۔ اگر آپ حیران
ہوں گے کہ حجاب کون تھی؟ بیشتر لوگ اسی ادھیڑ بن میں ہیں کہ حجاب واقعی شعر کہتی تھی یا
داغؔ نے اسے شاعرہ بنا دیا۔ چند تذکروں سے حجاب کے حالات نقل کئے جاتے ہیں۔

تذکرہ بہارستانِ ناز کے مؤلف نے حجاب کا حال اس طرح لکھا ہے :-

"منی بائی کلکتہ والی نے ایک چھوٹا سا دیوان بھی ترتیب دیا ہے۔ سلامتی سے عمر میں
ابھی انیسویں سال کی گرہ پڑی ہے۔ منشی شوکت علی صاحب سے کچھ مشقِ سخن بڑھائی ہے۔"

دل میں جگر میں پہلو میں سینے میں آنکھ میں ۔۔۔ اے عشق تیری شعلہ فشانی کہاں نہیں
دیتے ہیں چھیڑ چھیڑ کے کیوں مجھ کو گالیاں ۔۔۔ سمجھے ہوئے ہیں وہ مرے منہ میں زباں نہیں

برا کیا جو کہا ان سے معادل کا — غضب کیا جو محبت کو آشکار کیا
ہجو سُنا دیجیے آگے نادرے لطف بیاں — حضرت واعظ اترا ئیں ذرا مجھ سے آپ

(تذکرہ بہارستان ناز صد ۴۳-۴۴)

مؤلف تذکرۂ مشاہیر نسواں کا بیان ہے۔

منی بائی عرف منجھلی خوش باش کلکتہ ۱۲۸۶ھ کے پس و پیش میں عصمت اللہ نسخ سے اصلاح لیتی تھی، موسیقی میں کامل اور علوم مروجہ سے واقف تھی"

پھر تصور کاکل جاناں کا مجھ کو آ گیا — سینہ محزوں پر پھر دو سانپ لہرانے لگے
مزا یہی ہے کہ ہم بزم میں ہو بے چینی — مرے تڑپنے نے ان کو بھی بے قرار کیا

(تذکرۂ مشاہیر نسواں صد ۲۱۹)

مؤلف تذکرۃ النساء لکھتے ہیں:-

"منی بائی باشندۂ کلکتہ شاگرد مولانا نساخ "بہار" میں اس کو صاحب دیوان شوکت کا شاگرد قرار دیا ہے"

ایک دم بھی کسی کروٹ نہیں ملتا آرام — ہائے بے چین ہیں ہم درد جگر سے کیا کیا

(تذکرۃ النساء نادری صد ۱۶۷)

مؤلف تذکرۂ ماہ درخشاں رقمطراز ہیں:-

"منی جان طوائف ساکن کلکتہ"

تلخی ہجر بتاں زہر سے بدتر ہی سہی — تم وہاں غیر سے تھے شیر و شکر وصل کی رات
اے حجاب ان کو غرور اور ہمیں بات کا پاس — عیش و آرام ادھر تھا نہ ادھر وصل کی رات

(تذکرۂ ماہ درخشاں صد ۱۰۱)

مؤلف تذکرۂ نشاط افزا کا بیان ہے :-

"منی بائی کلکتہ کی مشہور طوائف تھی"

حال حجاب قابل شرح وبیاں نہیں	آنسو نہ ٹپکیں سن کے یہ وہ داستاں نہیں
دل ہیں جگر میں سینے میں پہلو میں آنکھ میں	اے عشق تیری شعلہ فشانی کہاں نہیں
پوچھو نہ حال زار مرا تم سے کیا کہوں،	گم کردہ راہ باغ ہوں یاد آشیاں نہیں
وہ اور میرے گھر چلے آجائیں خود بخود	سر پر مرے حجاب مگر آسماں نہیں

(تذکرۂ نشاط افزا صفحہ ۲۴-۲۵)

آخری تذکرہ "تذکرۃ الخواتین" میں مولوی عبدالباری آسی الدنی نے ۱۹۲۷ء میں لکھا ہے :-

"حجاب تخلص منی بائی نام مچھلی لقب، کلکتہ بازار کو لوٹولہ کی ایک طوائف تھی مولوی عصمت اللہ صاحب جو پہلے مجبور اور بعدازاں انسخ تخلص کرتے تھے اور مولوی عبدالغفور صاحب نساخ مصنف "تذکرہ سخن شعراء" کے شاگرد وقصبہ پنڈوہ ضلع ہگلی کے رہنے والے تھے اس کے شعروں پر اصلاح کرتے تھے، یہ شاعرہ اولاً کلکتہ میں رہی اور پھر رامپور بھی آئی موسیقی میں اس کو کمال تھا، ۱۲۹۹ھ میں عالم شباب تھا مرزا داغ دہلوی اور حجاب کے بہت سے افسانے مشہور ہیں۔"

(تذکرۃ الخواتین مطبوعہ نولکشور صفحہ ۵۲-۵۳)

یہ پانچ اقتباسات قدیم تذکروں سے اور ایک آخری اقتباس جدید تذکرے کا ہے، ان تمام تذکروں سے ثابت ہے کہ حجاب شاعرہ تھی ابتداً شوکت علی اور پھر انسخ سے مشورۂ سخن کرتی رہی بلکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آخر میں وہ نساخ سے مشورہ کرتی تھی،

پھر یہ معلوم کر کے آپ کی حیرت میں اور اضافہ ہوگا کہ حجاب نہ صرف شاعرہ تھی بلکہ استادی کا مرتبہ بھی رکھتی تھی چنانچہ اس کی چھوٹی بہن نقاب اُسی سے مشورہ سخن کرتی تھی، تذکرۃ النساء نادری نے لکھا ہے۔

"حمیدن بائی ساکنہ کلکتہ جس نے رامپور اور ڈھاکہ وغیرہ کی سیر کی ہے مسماۃ حجاب کی شاگرد ہے۔" (تذکرۃ النساء نادری ص ۱۲۶)

اس اجمال کی تفصیل تذکرہ بہارستان ناز نے کی ہے چونکہ آئندہ اوراق میں آپ کو حمیدن بائی نقاب ہمشیرۂ حجاب کا نام کئی جگہ نظر آئے گا اس لئے ہم اس کے حالات بھی نقل کئے دیتے ہیں تاکہ آپ بی نقاب کو بھی بے نقاب دیکھ سکیں۔

"حمیدن نام کلکتہ خاص اس کی پیدائش کا مقام رامپور سے ڈھاکہ تک کی یہ شاعرہ خوب سیر کی ہوئی ہے۔ طرز کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی طرح دار کو دل بھی دیا ہے حالانکہ مالدار ہے مگر طبیعت میں انکسار ہے، چوٹی ناگن ہے زلف بلا ہے، خوبصورت گلا ہے اس کے ناچ کے ٹھاٹھ ناچی کشکول کو انگلیوں پہ نچاتے ہیں، بتانے کے ڈھنگ عاشقوں کو ملک عدم کا سیدھا رستہ بتاتے ہیں۔" بھاؤ میں لبھاؤ ہے، بگڑنے میں بناؤ ہے، سولہ برس کا سن جوانی کے ارمان نکلنے کے دن شاعری سے رغبت عروض میں ضروری مداخلت، یہ رشک ماہ شاگرد بی حجاب ہے کیوں نہ ہو یہ شاعرہ بھی تو اپنی ہمعصر شاعروں میں انتخاب ہے اسی حجاب اپنی ہمشیرۂ کلاں سے مشق سخن کرتی ہے۔"

میرے بجائے اس نے عدو کو بٹھا لیا	یہ داغ رشک مجھ سے اٹھایا نہ جائیگا
وہ اور وصل غیر یہ امر محال ہے	تسکین دے رہا ہے مجھے یار کا حجاب

فلک کے عدو کے دل غمزدہ کے — کہیں کیا کہ کس کے ستائے ہوئے ہیں
وہ دور سب بزم جاناں میں میں بیٹھا رہ گیا — یہ نہ بولا ہائے کوئی بیکہ پہچانا لے
ذرا ہم کو سونے دے اے صبح محشر — شب ہجر کے ہم ستائے ہوئے ہیں
نہ گئے گھر میں غیروں کے ہم نے مانا — مگر کچھ تو ہے جو لجائے ہوئے ہیں

(تذکرہ بہارستان ناز صفحہ ۱۰۹)

آپ نے حجاب و نقاب دونوں کو پہچان لیا ہوگا قصے کے تسلسل کی خاطر ہم ایک بار پھر لکھ دینا چاہتے ہیں کہ منی بائی نامی کلکتہ کی ڈیرہ دار جس کا تخلص حجاب تھا ۱۸۸۱ء میں رامپور کے بے نظیر کے میلے میں آئی اور داغ سے ملاقات ہوئی چند روز دونوں کی یکجائی بھی رہی اور پھر وہ کلکتہ چلی گئی مارچ ۱۸۸۲ء میں داغ نے پھر سے رامپور بلوایا اور وہ بے نظیر کے میلے میں آئی اور دو مہینے رامپور میں رہی اور کلکتہ واپس ہوئی کلکتہ پہنچ کر اس نے داغ کو بلوایا اور اوائل یا وسط ماہ جون ۱۸۸۳ء میں داغ کلکتہ پہنچے اور پھر دونوں کی یکجائی رہی اور پندرہ بیس روز کے بعد ہی داغ کو نواب صاحب رامپور نے بلوایا اور وہ ۳ر جولائی کو کلکتہ سے روانہ ہو گئے اس طرح تین طویل ملاقاتیں داغ اور حجاب کی رہیں،

داغ کی پیدائش ایک جاگیردار کے گھر میں ہوئی تھی اور تعلیم و تربیت دہلی کے لال قلعہ میں وہ تمام لوازمات جو جاگیرداروں اور رئیسوں کی زندگی کے لئے لازمی اور ضروری تھے داغ کو میسر رہے، لال قلعہ چھوٹا تو داغ نے رامپور آباد کیا اور وہاں نواب صاحب رامپور کی مصاحبت نصیب ہوئی جو بڑے ہی رنگین مزاج اور شوقین مہر تھے، اس کا اثر بھی داغ پر خاصا پڑا اور داغ حسن و نغمہ میں فنا ہو کر رہ گئے،

غدر سے پہلے ہندوستان میں طوائف سوسائٹی کا جزو سمجھی جاتی تھی حقیقت یہ ہے کہ
طوائف سے مراد اُن دنوں فحش پیشہ عورتیں نہ تھیں بلکہ وہ خاص طبقہ تھا جو گانے ناچنے
کے فن کا ماہر مجلسی علم سے واقف اور تہذیب و تمدن کا نمونہ ہوتا تھا، اس طبقے کا رہن سہن
اس کا رکھ رکھاؤ اس کی طرز معاشرت خاص تھی شرفا اس سے خلا ملا رکھنا بُرا نہ سمجھتے تھے
ہر امیر، ہر رئیس ہر شریف شخص کے پاس ایک طوائف نوکر تھی جو روزانہ ایک خاص
وقت تک کے لئے آتی گانا سناتی یا تھوڑی دیر اپنی بذلہ سنجی سے دل بہلاتی تھی اچھے
سے بڑے مولوی بھی طوائف سے ملنا معیوب نہ سمجھتے تھے پھر ڈیرہ دار طوائفیں ان میں
بھی خصوصیت اور اعزاز رکھتی تھیں، ایسی ہی ایک ڈیرہ دار طوائف منی جان حجاب تھی جس
سے داغ کی ملاقات بے نظیر کے میلے میں ہوئی اور داغ اپنی حسن پرستی اور نغمہ دوستی کی
وجہ سے اس کے گرویدہ ہو گئے۔ ان دنوں داغ کی عمر پچاس سال سے زائد ہو چکی تھی۔
جنسی اعتبار سے یہ عمر عشق و عاشقی کی نہ تھی اور پھر داغ اعصابی امراض میں مبتلا بھی تھے
ان وجوہ سے ان کی عاشقی کسی جنسی یا نفسیاتی خواہش کی بنا پر نہ تھی بلکہ حسن و نغمہ اس کا محرک
تھا۔

چونکہ داغ جذباتی آدمی تھے اس لئے حجاب پر بڑی شدت سے دل آ گیا تھا پہلی دفعہ
مارچ ۱۸۸۲ء میں حجاب، داغ سے مل کر اپریل میں رامپور سے واپس چلا گئی تو ۲۰ اپریل
کو داغ نے نواب بہادر حسین خاں انجم نیشاپوری کو لکھا۔

"وہ قافلہ لکھنؤ سے عظیم آباد پہنچا، وہاں سے ایک قیامت نامہ میرے نام آیا
جس کا مضمون قابلِ تحریر نہیں...... میں چاہتا ہوں کہ جو حال آپ نے دیکھا
وہ میری کیفیت کسی اور سے نہ کہنا خدا کے واسطے خاک میں نہ ملا دینا"

(انشائے داغ صفحہ ۴۸،۴۹)

پھر ۲۲؍ جولائی ۱۸۸۱ء کو نواب انجم ہی کو لکھا ہے :۔

"حجاب سے بے وجہ ترک نامہ و پیام ہے کم بخت اک بلائے بے درمان تھی کہ جس کے تصور سے اب تک نجات نہیں ہر چند اب بہت صبر آگیا ہے لوگوں نے یقین ہے اس کو بہکایا ہے خدا ایسوں کو غارت کرے، داغ کے مزاج میں بے وجہ عتاب کی تاب نہیں آپ نے ناحق میری تصویر ان کو بھیجی، میں ان سے کمال ناراض ہوں آج کچھ طبیعت اچھی نہیں ورنہ گرما گرم جواب دیتا۔"

(انشائے داغ صفحہ ۴۹)

حقیقت یہ ہے کہ داغ ایک شاعر تھے خیال عاشقی ہمیشہ کرتے رہے اور خیالی مضامین ہی باندھتے رہے عملی طور پر انہوں نے یہ پہلی عاشقی کی تھی اور بسم اللہ ہی غلط ہوئی تھی کیوں کہ ابتداء ہی سے ان کو شکایتیں پیدا ہو گئی تھیں، یہ چھیڑ چھاڑ سال بھر تک جاری رہی ۱۸۸۲ء میں داغ نے بڑی کد و کاوش سے حجاب کو رامپور بلایا اور وہ اپنی بہن حمیدن بائی نقاب کے ساتھ رامپور آئی تو نواب خلد آشیاں کے چھوٹے بھائی نواب حیدر علی خاں کے گھر پر چند روز رہی کیوں کہ ان سے حجاب کے قدیم مراسم تھے، داغ نے حجاب کی نقل و حرکت کی ٹوہ لینی شروع کی اور جب انہیں تفصیلات معلوم ہوئیں تو حجاب کو ایک خط لکھا :۔

"ستم گر ستم پیشہ! شوقِ ملاقات کے بعد مدعا نگار ہوں کہ تم دو روز سے نواب صاحب کے یہاں تھیں، یہاں واہ یہ عجیب عالم گزر گیا میں نہیں مانوں گا کہ تم مجبور ہو کر گئیں، اس ریاست میں ایسی بھی خدا کی بندیاں موجود ہیں کہ رئیس کے ہزار دباؤ پر بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتیں جن سے واسطہ ہے اور جن سے

——————— وفاداری کا عہد کر چکی ہیں ۔ اپنے قول پر قائم ہیں۔
ایک طرف دولت ہے ریاست ہے ہر طرح کی شان و شوکت ہے لیکن
محبت کا نام وہاں عنقا رکھا گیا ہے، تمہارا دل دادہ ان کے مقابلے میں کوئی
خوبی نہیں رکھتا مگر تمہاری الفت میں جان سے گزر سکتا ہے ۔ کیا میرے
رقیب بھی ایسا کر سکتے ہیں؟ تم کو یقین ہے؟ اور جب نہیں کر سکتے ! تو پھر کس
لئے تم داغ سے پرستار کو محو کئے ہوئے ہو؟ دل پر جبر کر کے لکھتا ہوں کہ اگر قطعی
ترک تعلق منظور و پسند نہیں تو پھر دید و شنید سے کیوں محروم رکھا جاتا ہے؟

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

یہ رقعہ تمہیں جلانے کے لئے نہیں لکھا ہے نہ اس کا مطلب طعن و تشنیع ہے
مدعا یہ ہے کہ آپ تشریف لائیں اور میری کچھ دلداری فرمائیں" (بلا تاریخ)

"(خطوط داغ ۳۰) ۰۰۰

شاید اس کے جواب میں حجاب یہ باور کراتی ہے کہ نواب نے مجھے بلوایا
تھا اور میں مجبور ہو کر گئی تھی اس کی بنا پر داغ نے اپنے ایک دوست کو جن کا نام معلوم
نہ ہو سکا ایک خط لکھا ہے جو بڑا مزے دار ہے آپ بھی لطف اٹھایئے"۔

"محبِ داغ! اگر آپ مجھے یہ لکھیں کہ نواب صاحب کی بلائی ہوئی حجاب گئی
تھیں یا خود انہوں نے ڈورے ڈالے تھے، تو بڑی بندہ نوازی ہوگی میرا
دل و دماغ پھک چکا ہے دل میں زخموں کی حد نہیں رہی اور پھر یہ روز و شب
کی نمک پاشی کیا جاتا ہوں آپ طرفین کے حالات سے خوب واقف ہیں؛

خوب معلوم ہے آپ کو کہ نواب صاحب کے مقابلہ میں سوا اس کے کہ ـــــــ
اپنے عشق کی آگ میں جل بھن کر کباب ہوجاؤں کچھ نہیں کر سکتا، آپ شاید نواب
صاحب سے کہہ سکیں کہ داغ حجاب کے تیرِ نظر کا بے طرح گھائل ہے آپ کی دلبستگی
کے لئے اور بھی سامان ہیں لیکن بے چارہ حجاب کو نہ پائے تو کہاں جائے اور اگر
کہیں جائے تو وہ پھانس جو دل میں ہے رت ہے کیسے دور ہو، جواب کے انتظار میں
بے چین ہوں۔" (بحوالہ تاریخ خطوطِ داغ)

معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کو داغ نے یا تو بغیر سوچے سمجھے حالت اضطراب میں
لکھا ہے یا پھر نہایت غور و فکر کے بعد لکھا ہے کیونکہ اس میں نواب صاحب سے مطالبہ
کیا ہے کہ حجاب کو اپنے لئے چھوڑ دیں، ایسی خواہش یا تو کوئی نادان ہی کر سکتا ہے یا پھر
وہ نفسیات داں جس کو اپنی نفسیات دانی اور مطالعۂ نفسِ انسانی کا زعم ہو اور جو یہ یقین
رکھ سکتا ہو کہ یہ حربہ کارگر ہوگا اور اس کا پورا پورا اثر ہوگا،

داغ فطرتاً نفسیات داں تھے قدرت نے انہیں عجیب و غریب دل و دماغ
دیا تھا انسان کی فطرت کا مطالعہ انہوں نے خوب کیا تھا اور ایسے نفسیاتی حربے استعمال
کرتے تھے جن کا توڑ نہ ہو سکے، معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ نے داغ کا پیام نواب حیدر علی
خاں کو پہنچا دیا اور اُن پر وہی اثر ہوا جو ہونا چاہئے تھا انہوں نے جواب میں کہا ہوگا،

"بھئی داغ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں، میں نے حجاب کو جبراً تھوڑا ہی بلا یا ہے
اور پھر ابھی اسے اپنا پابند تھوڑا ہی کر رہا ہوں وہ چاہے تو ابھی داغ کے پاس چلی جائے۔"
یہ جواب سن کر داغ کے دوست نے انہیں ساری تفصیل لکھی ہوگی، کہ حجاب خود ہی یہاں
آئی ہے اور راضی خوشی نواب صاحب سے خوش فعلیاں کر رہی ہے ممکن ہے کہ کچھ تفصیلات

اور بھی لکھی ہوں اس پر داغ نے پھر وہی حرکت کی جو اس سے پہلے کر چکے تھے اب کی بار ایک خط حجاب کو لکھا اور ایسا بھرپور وار کیا کہ حجاب بھی تڑپ گئی ہو گی ۔

"بے مہر و وفا! کل اُس محفل سے با دلِ داغدار اور یاس و حرماں کا گھرا چرکا کھا کر آیا ہوں اس وقت سے سوچ رہا ہوں کہ آخر یہ تماشا کب تک ؟ معاملہ یکسو ہونا ضروری ہے۔ صبح و شام ہوتے ہوتے اتنا زمانہ تو گزر گیا آخر کوئی حد بھی ہے، کب تک مطاعن جگر دوز سنوں ؟ کلیجے میں ناسور پڑ گئے، اب تو ان کا علاج کرنا ہی ہو گا، کہئے آپ کے دل کی ہوس گھٹی یا بڑھی ؟ وہ آدمی ضرور بے حس ہے اور اس کے سینے میں بجائے دل کے فولاد کا ٹکڑا رکھا ہوا ہے جو یہ منظر دیکھے اور چپ رہے! بے شک تم نے حرملہ اور ابن سعد کے گلے میں بانہیں ڈالیں، تم بے شک خولی اور ابن نمیر کی گود میں بیٹھیں! اور تم یقیناً یزید کی معشوق نہیں! میرے جسم میں خون ہانڈی کی طرح پک رہا ہے، انہیں یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب شکیسے مل کر نوچا کھسوٹا کریں ۔! آخر یہ کیا سر میں سمائی ہے ؟ کون جانے اس کا کیا انجام ہو ؟ جی لیل و نہار ہیں تو داغ کا سلام قبول ہو! دل پر صبر کی سِل رکھوں گا مگر تمہارا نام نہ لوں گا ! آخر بیحیائی کی کوئی حد بھی ہوتی ہے ۔" (بلا تاریخ ، ۱۸۸۲ء خطوط داغ)

داغ کے اس تیر و نشتر بھرے خط نے پورا پورا اثر دکھایا حجاب حیدر علی خاں کے پاس سے اپنی قیام گاہ کو واپس ہو گئی چونکہ جھینپی ہوئی تھی اس لئے اپنی بہن نقاب سے ایک چٹھی داغ کو لکھوا دی کہ طبیعت خراب ہو گئی ہے اس لئے نہ آسکیں اس کے جواب میں داغ نے ایک خط نقاب کو لکھا ہے ۔

بی حمیدن بائی! تم نے یہ خوب سنائی کہ وہ آنے والی تھیں مگر ناگہاں طبیعت

خراب ہو گئی جان کے لالے پڑ گئے، وہ تو زندگی تھی کہ دو تین گھڑی دورے نے تکلیف اٹھا کر وہ ٹھیک ہو گئیں، گل خان صاحب بھی آئے تھے۔ ان سے دیر تک ذکر رہا وہ دیر تک وہاں بیٹھ کر آئے تھے انہوں نے تو اس قسم کی کوئی بات نہیں کہی جس سے ناگہانی علالت کا پتہ چلتا، یہ کیا بات ہے آخر ایسا کیوں مجھے لکھا گیا، اس سے کیا مقصد تھا، کیا میری آزمائش منظور تھی؛ سوچتی تو ہوں گی کہ داغ کتنا سنگ دل ہے، تکلیف اور بیماری کا حال سن کر بھی بھاگا ہوا نہیں آیا اور اگر کسی وجہ سے آنا ممکن نہ تھا تو خیر خبر بھی نہ لی۔

اب اس پرچے سے اصل بات معلوم ہو گی تو ہوش اڑیں گے بڑا لطف آئے گا اور پتہ چلے گا کہ ہم اتنے بے خبر نہیں رہتے جتنا کہ وہ خیال کئے ہوئے ہیں؛ اس میرے پرچے کو دیکھ کر کیا رنگ ہوا ہو گا سب حال مجھے لکھ بھیجا۔"

(بلا تاریخ، خطوطِ داغ $\frac{۱۲۵}{۲}$)

اس طرح حجاب کے رام پور میں رہنے تک جھک جھاک ہوتی رہی مگر داغ نے فریاد میں اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے مگر ؎

حیا دل میں یہ اتفاق کی بات — ان سے ایسی ہوئی نفاق کی بات

کہہ کر کچھ اشارے ضرور کر دئے ہیں اور ؎

آگے کیا ایسے ذکر چھیڑوں میں — گڑے مردے عبث اکھیڑوں میں

کہہ کر یہی خوش گزرانی کا حال کہا ہے کہ ؎

گزری اوقات عیش و عشرت سے — دو مہینے تک ایک صورت سے

غرض اس طرح داغ نے دل لگا کر دلگی کا مزا اٹھایا ہجر و فراق کے تخیلی صدمے

اب تک سہا کرتے تھے اب واقعی انہیں ہجر و فراق نصیب ہوا رقابت کی خیالی تصویریں کھینچا کرتے تھے اب واقعی رقیب سے واسطہ پڑا اور پھر بڑی ایمانداری سے کہنا پڑا مسحر کر لیا آخر کو بنگالے کے جادو نے بڑا بول آگے آیا ہم جو بولے تھے لڑکپن میں یہ دو مہینے جن کے عیش و عشرت میں گزرنے کا ذکر داغ نے کیا ہے عیش و عشرت کے ساتھ ہی ساتھ رنج و تعب میں بھی گزرے مگر جب حجاب رامپور سے جا رہی تھی تو داغ اس سے خوش تھے اور دونوں ایک دوسرے سے صاف تھے چنانچہ حجاب کے جانے کے بعد داغ نے جو خطوط حجاب کو لکھے ہیں ان میں سے ایک میں یہی ملتا ہے:-

"

دلدار و دلنواز! کیا غضب ہے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی تمہاری نگاہیں پھر گئیں وہ سب قول و قرار یک لخت فراموش کر دیئے خط روانہ کیا تھا، وہاں کی دلچسپیوں میں اتنی محو کہ جواب دینا محال ہو گیا۔ میرے سینے میں دل نہیں یا دل میں تڑپ نہیں؟ کیا بے قرار ہونا مجھے نہیں آتا؟ کیا تملا نا میں نہیں جانتا؟ اس خط کا جواب جلد سے جلد نہ آیا تو بازار سے جا کر زہر لاؤں گا اور بے موت مر کر دکھا دوں گا! تم سے وعدہ لیا تھا۔ اور تم وعدہ کر کے گئی تھیں کہ روز نہیں تو ہفتے میں دو بار خط ضرور لکھا جائے گا، آج دس دن ہو گئے خیر ہے نہ خبر! اور کچھ اگر نہ لکھتیں تو خیریت ہی اطلاع دے دیتیں یہاں تو جس روز سے گئی ہو جان پر بنی ہے کوئی بات اچھی نہیں لگتی، جب تک تمہارا خط نہ آئے دل کو کیسے چین آئے؟

(ملاحظہ تاریخ خطوط داغ ص ۲۳)

داغ کا کوئی خط اس کے بعد کا ہمیں نہیں ملا ورنہ اگست ۱۸۸۵ء تک کا کوئی

خط مل سکا، البتہ صدیق مکرم امتیاز علی خاں عرشی رامپور نے اپنی نوازش سے داغ کے
(۳۰) غیر مطبوعہ خطوط کے مسودے ہمیں عنایت فرمائے ہیں جو بڑے کارآمد اور اہم ہیں
یہ مسودات فیروز شاہ خاں فیروز رامپوری نے جمع کئے تھے جو رامپور میں باہر کے اخبارات
کے رپورٹر اور داغ کے مخلص دوست اور شاگرد تھے، چونکہ فیروز داغ کے پاس کے حاضر
باشوں میں سے تھے اس لئے وہ داغ کی عاشقی کے قصے سے واقف تھے اور یہ
معاملات ان کے سامنے ہی ہوتے رہے، مثنوی فریاد داغ انہیں کے سامنے کہی گئی اور
انہوں نے اس کی تاریخ بھی کہی ہے جو فریاد داغ کی اشاعت اولین میں طبع ہوئی ہے
اس لئے یہ مسودات قابل اعتبار اور لائق استناد ہیں،

ان خطوط میں پہلا مسودہ خط ۱۲ راگست ۱۸۸۲ء کا ہے اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ کلکتہ کے کسی انگریزی اخبار میں کسی منی بائی کے انتقال کی اطلاع چھپی تھی۔ جو
بخشی عبدالرحیم خاں نے داغ کو سنائی۔

"منی جان! تمہیں اللہ کی امان! اس وقت دن کے گیارہ بجے ہیں بخشی عبدالرحیم
خاں صاحب میرے پاس اخبار انگریزی لائے، بہت پریشان آئے، میں نے کہا بخشی
خیر تو ہے؟ تو کہا منی بائی کا کچھ حال ہے! یہ سنتے ہی ہوش و حواس جاتے رہے،
انہوں نے ترجمہ کیا مجھے یقین ہوا کوئی اور منی ہوگی آب و دانہ حرام ہوگیا، دل
کو سمجھاتا ہوں نہیں مانتا، ترجمے کو دیکھ کر کیفیت مفصل جلد لکھو۔ زیادہ خیریت!!

۵ ستمبر ۱۸۸۲ء کو داغ نے حجاب کو بڑے مزے کا خط لکھا ہے :۔

"نونہال چمن حسن و جمال حمیدن بائی صاحبہ و فاخصال بلکہ ادبہار! آج تمہارا خط
آیا مگر مدت کے بعد اس سے پہلے دو خط بائی صاحب کے آئے، میرا حال قابل افسوس

بے بائی صاحبہ کا ایک خط جو قابلِ ملاحظہ بندگانِ حضور تھا، وہ پیش ہوا اور
نہایت باعثِ انبساط و سرور ہوا۔ میں تو مہینے بھر سے دربار نہیں گیا، مصاحبوں
کی زبانی معلوم ہوا کہ نہایت تعریف فرمائی اور واقعی جو ایسی خیرخواہانہ بات کہے
گا اس کی تعریف کیوں نہ ہوگی۔ مجھ کو تم صاحبوں سے نہایت شکایت و ملال ہے
اگر تم خط نہ بھیجتیں تو میں ہرگز یہ سلسلہ جاری نہ رکھتا۔ ذرا غور کرو۔ انصاف سے
دیکھو، کیا کیا تدبیر دستی تمہاری عزت و نام آوری میں کی گئی۔ کاش اس قدر میں
دیدار تمہارا کا مشتاق ہوتا! ایسی ردی حالت میں جس سے محبت ہوتی ہے وہ
بہت یاد آتا ہے۔ میں نے پہلے سنا تھا، قرآن اٹھ گئے ہیں عہد و پیمان ہو گئے
ہیں مجھ سے نہ ملنے کے! اب یقین ہوا، مجھے بھی منظور نہیں کہ میرے ملنے
سے بائی جی کے ایمان میں فرق آ جائے۔ ؎

ہر ملاقات تو صفائی سے ہے اور صفائی نہیں تو پھر کیا ہے

بائی جی کو لگا لینا آتا ہے لگا رکھنا نہیں آتا۔ اس سے یہ دشوار ہے۔ لعنت
ہے اس ملاقات اور اس دشمنی پر کہ جو بُرے وقتوں میں کسی کے کام نہ آئے۔
یہ لکھا دن ہے کہ ایک تار بھیج چکا ہوں پہنچا تو ضرور ہوگا ؎

جدائی تری کس کو منظور ہے

زمیں سخت ہے آسماں دور ہے

یہ جملہ مجھے بہت پسند آیا، بائی جی کے "دماغ کا مزاج" میری طرف سے ضرور
پوچھ لینا! ان کے زکام سے اور بھی زکام ہوا تمہاری علالت بھی ابھی چلی ہی
جاتی ہے خدا خیر کرے۔ دو وجہ سے میرا کلکتے آنا ہوتا ایک بائی جی سے ملاقات

دوسرے حکیم واد ارنجش سے معالجہ، بائی جی سے مایوس ادھی ہوا، حکیم جی کا حال روی سنا نہایت صدمہ اٹھایا...... فصد اور جونکوں کے بعد پرسوں اقتاس کا مسہل ہوا کچھ ہی ہضم نہ ہوئی جلاب کے دستوں کے علاوہ تخمہ کے دست شروع ہوئے آج اتنی طاقت نہیں کہ دوسرا مسہل ہو تا کل یا پرسوں ہوگا .....“

حمیدن بائی نقاب کو خط لکھنے سے پہلے ۴ر ستمبر ۱۸۸۵ء کو اپنے دوست اور شاگرد مہاراج یوراج بیر یہ تھا کہ ہر کشن بہادر بیدآر کو ایک خط لکھا ہے:۔

”مہاراجہ والا نشاں دام الطافکم بعد تسلیم ہماری قبول ہو، گرامی نامہ آیا، آنکھوں سے لگایا، خط جو کھول کر دیکھا تو نوٹ پایا، نہ ہنڈوی کلدار علیہ السلام عجیب چیز ہیں بالفعل داغ کلکتے جانے والا ہے ایک ہزار تو ادھر سرکائیے، دنیا میں جو کوئی رئیس ہوتا ہے بے اختیاری میں بھی لوازمات ریاست اور مستحقانِ ریاست کا خیال رکھتا ہے، یہ ریاست ہی نئی دیکھی، میرا باپ بھی رئیس تھا اور بھی ریاستیں دیکھیں بادشاہت بھی دیکھی، تعلقداروں کو بھی دیکھا، یہ بات کہیں نہیں دیکھی اور نہ یہ استادی شاگردی دیکھی .... ہ

آپ ہیں راجہ حضرت بیدار
بھیجئے جلد داغ کو کلدار
آگے توفیق!“

میرے راجہ بہادر! مجھ کو کیا معلوم کہ کانِ پنجاب جانِ پنجاب کون ہے امیری عاشق مزاجی کا شاہد میرا کلام ہے جب سامنے معشوق ہوتا ہے تو سو سرود حاصل ہوتے ہیں، مجھ کو شراب پینے کی ضرورت نہیں، تمہارا استاد بوڑھا ہے

مگر ہزار نوجوانوں سے بہتر ہے کبھی دل میں آتا ہے اپنا عاشق آپ ہو جاؤں، راجہ صاحب! ہمارے عاشق تم ہو جاؤ، خدا کے لئے ہو جاؤ، بلگوان کے لئے ہو جاؤ، منی بائی حجاب تخلص جو صاحبِ مثنوی فریاد داغ ہیں، ہر چند بلاتا ہوں نہیں آتیں، وہ مجھ کو بلاتی ہیں مجھے حضورِ پُر نور جانے نہیں دیتے اور بالفعل میرے دم ہی پر بنی ہے، پشت پر ایک دانہ نکلا ہے جس کی سوزش الحفیظ تصرف ہوئی جونکیں لگیں مسہل ہوئے آپ بھی دعا کیجئے اور میری علالت اخبارات پنجاب میں چھپوا دیجئے۔ کہ سب احباب کو خبر ہو جائے کلکتے کے اخباروں میں چھپ گئی، راجہ صاحب! آپ اپنی طرف سے ایک خط منی بائی حجاب کو ضرور بھیجئے بدیں مضمون کہ ہماری نظر سے آپ کی مثنوی گزری اگر یہ حال سچ ہے تو نہایت لائق آدمی ہو۔ بلکہ منتخب روزگار ہو مگر ایک بات سے تعجب ہے کہ باوصف اس علالتِ شدید کے جس کا صدمہ تمام ہندوستان کو ہے اور خلقِ خدا دست بدعا ہے آپ رامپور نہ جائیں! اگر ہزار روپیہ کی نوکری ہیں تو ایسے وقت میں نوکری چھوڑ دیتیں وضع داری سے نہایت خلاف ہے، عجب تم سا شخص باوصف اس خلق کے ایسی کج ادائی کرے۔ تو کیا کسی سے امید ہو اور اگر مصارف کی ضرورت ہو تو میں صرف مناسب کا کفیل و وکیل ہوں ہمارا یہ صاحب! یہ نہ جانیے کہ استاد مجھے پھنساتے ہیں وہ ایسے آدمی نہیں کہ میرے باب میں اور کسی سے تکلیف ہو یہ الفاظ آپ کے مرتبے کے موافق لکھوتے جاتے ہیں اگر وہ آپ جائیں آپ کے خط کے جواب میں دیر ہو تو آپ ان سے تار جوابی حاصل کر کے مجھے اطلاع دیجئے گا میرا مدعا یہ ہے کہ ہر طرف سے اس پر دے کی جائے۔ مگر پھر یہ کہتا ہوں کہ دار ضرور دوں گا جو آپ کو توفیق ہو۔۔۔"

سُنا آپ نے! داغ کتنے کھرے آدمی تھے اپنا بس نہ چلا تو راجہ امید ار کو لکھا کہ تم حجاب کو لکھو اس طرح وہ حجاب پر دباؤ ڈلوانا چاہتے تھے تاکہ چو طرف سے لوگ اسے مجبور کریں اور وہ رامپور آئے مگر مشکل یہ تھی کہ رامپور میں نواب حیدر علی خاں تھے جو حجاب کے پرانے دوست تھے وہاں پہنچ کر ان سے نہ ملنا حجاب کے لئے ناممکن تھا اس لئے وہ رامپور جانے سے کتراتی تھی مگر داغ تھے کہ اُسے رامپور بلانا چاہتے تھے جب وہ رامپور آنے سے قطعاً انکار کر چکی تو خود داغ نے کلکتہ جانے کا ارادہ کیا چنانچہ یکم اکتوبر ۱۸۸۵ء کو منی بائی کو خط لکھا ہے۔

"میزبانِ داغ جہان سلامت رہو! پہلے بھی خط روانہ کر چکا ہوں ایک ایک دن مہینہ ہو رہا ہے، اگلی بار جو میں گیا تھا کھانا پکانے والے کی طرف سے نہایت تکلیف اٹھائی تھی میرے فرزند مرحوم کی انّا جو تمہاری خدمت میں بھی حاضر ہوئی تھی آج مستعد ہوئی کہ اپنی روانگی سے پیشتر مجھے وہاں پہنچا دو، میں سب کام کر دوں گی بائی جی کی خدمت میں رہوں گی، کھانا بھی اچھا پکا لیتی ہے اگر تم مناسب جانو تو میں اس کو پہلے روانہ کر دوں، بغیر تمہارے وہ نہ رہے گی اور مردانے مکان میں میں نہ رکھوں گا، اس میں جو مناسب جانو وہ مجھے ہدایت کرو۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ جس مکان میں پہلے ٹھہرا تھا وہی میرے ہاتھ لگے، میاں عبدالرزاق کو بھی اس باب میں لکھا ہے دیکھئے کیا جواب آتا ہے۔"

۱۹ ذی الحجہ ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۹ء کو حجاب کے نام ایک خط لکھا ہے۔

"مہربانِ داغ قدردانِ داغ سلامت رہو! لو مبارک ہو! واہ میں بھی کیا خودغرض آدمی ہوں اپنا مطلب نکلے اور دوسروں کو مبارکباد دی، جی تو چاہتا تھا نہ لکھوں

کرستا گزر جائے گا خدا جانے کون کون اس رنگ سے مر جائے گا کیا کروں بغیر لکھے بھی تو بن نہیں آتی، وہ آرزو کہ سوا تین برس سے دل میں تھی الحمد للہ کہ اب بر آئی، بگاڑ کر جانا تمہارے پاس ہرچند منظور نہ تھا مگر نہ تو میری آدمیت نہ تمہاری اجازت حضور پر نور دام اقبالہم نے جان لیا کہ اس کی جان مفت میں جاتی رہے گی، پرسوں بطیب خاطر فرمایا کہ تم کلکتہ چلے جاؤ بغیر وہاں کے جائے اور ہوا کھائے سنبھلتے نظر نہیں آتے وہاں جاکر دو چار ہفتے میں آسکتے ہو عدم کو جاؤ گے تو میں کہاں پاؤں گا، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں! میں نے بسر و چشم منظور کیا جی تو یہی چاہتا تھا کہ دو دن میں اڑ کر چلا جاؤں مگر طاقت سفر ابھی کہاں؛ گرمی وہ پڑتی ہے کہ الاماں، گل نیلوفر، دھنیا، تخم بالنگ خیارین، شربت آلو، یہ پینے کو ملتے ہے حرارت بڑھی ہوئی ہے، مانع سفر ایک اور امر ہوا کہ محرم شریف میں دوسرہ واقع ہوا، ہندو مسلمان میں جھگڑا پھیلا ہوا ہے، دیکھئے کیا ہوتا ہے اس کا انتظام ضرور ملحوظ رہے لہذا حسب تجویز سرکار عالی وقار چودھویں محرم کو یوم روانگی مقرر ہوا اللہ راس لائے اور تم سے ملائے، یہ بھی اطلاع ہو کہ بے اطلاع آؤں یا با اطلاع پہلے دیر دولت پر سلام کو حاضر ہوں یا اور کہیں ٹھہروں ....

بہت دل شکستہ ارمان بھرا بے سروپا آتا ہوں، میری لاج تمہارے ہاتھ ہے یا خدا کے ہاتھ، تمہارے گھٹنے کے درد نے بے چین کر دیا ٹھہر بھی نہیں سکتا......... میں نہیں چاہتا کہ میرا ابھی جانا وہاں ظاہر ہو اس خط کو پڑھ کر چاک کر ڈالنا تمہاری وجہ سے وہاں میرے دشمن بہت ہیں خدا سے تائید اور تمہارا التفات چاہتا ہوں، بہتر تو یہی تھا کہ میں مصارف زادِ راہ بھجوا دیتا اور تم قدم رنجہ فرماتیں مگر کلکتہ کی قطب بن

کر بیٹھ گئی ہو، میں کیا کروں میرا ارادہ جریدہ آنے کا ہے ——————

اصل میں داغ کلکتہ جانے کو تیار ہو گئے نواب صاحب نے اجازت بھی دے دی تاریخ بھی مقرر ہو گئی،

داغ کا ایک خط حجاب کے نام بلا تاریخ اور بھی ہے، اس خط میں مصنوعی دانت نہ بھجوانے کی شکایت اور فریاد داغ کا حال ہے:

"واللہ منی بائی! تمہاری کم التفاتی سے مجھے بہت رنج ہوا، آئندہ تکلیف نہ کرنا میں نے تجویز کی ہے کہ میرٹھ میں انگریزی کاری گر ہے اس کو بلاؤں، تمہارا تو بہت انتظار کیا جواب دنداں شکن پایا......"

"مثنوی تمہاری تھی تمہارے حال کی تھی، تمہاری صفات کی تھی، میں نے حالِ واقعی موزوں کر دیا ہے ...... صاحب مطبع نے پندرہ سو چھاپی تھیں، مہینہ بھر میں فروخت ہو گئیں مکرر چھپے گی، خدا جانے اس مثنوی کا اثر تم نے کیا دیکھا مجھ پر تو چاروں طرف سے بوچھار ہے اور اشتیاق ہے جو اس کلام کو دیکھتے ہیں جانتے ہیں کہ مرزا داغ سلامتی سے سولہ برس ہوں گے .... حافظ احمد علی خاں صاحب گلدستہ ریاض سخن کے ہاں جو مصرع طرح ہوا ہے اس میں ایک مطلع میں نے بھی لکھا ہے، اس کی داد چاہتا ہوں سے

سب کچھ تو ہو چکا یہ فقط انتظار ہے — کہدیں بگڑ کے آپ تجھے اختیار ہے"

اس آخری جملے کو آپ غور سے پڑھیں تو صاف ظاہر ہو گا کہ داغ حجاب کی سخن فہمی کے بھی قائل تھے اور اب تک داغ اور حجاب کے تعلقات نہایت ہی پاک و صاف تھے داغ کو حجاب پر اختیار حاصل نہ ہوا تھا، فقط ظاہری دھوم دھام تھی،

۲ فروری ۱۸۸۶ء کو عبد الغفور نساخ کے نام ایک بہا چوڑا خط داغ نے لکھا

۵۸۴٠

ہے جس میں من جملہ اور باتوں کے ایک جملہ یہ بھی ہے :-

"یقین ہے کہ حجاب سے آپ ضرور ملے ہوں گے اور بموجب اپنے عہد کے آپ نے ہمارا انصاف کیا ہوگا"

نساخ ابتداً داغ کے مخالف تھے چنانچہ انہوں نے اپنے تذکرۂ سخن شعرا (مطبوعہ ۱۸۷۴ء) میں داغ کے متعلق لکھا تھا۔

"داغ تخلص نواب مرزا خاں دہلوی ولد چھوٹی بیگم شاگرد شیخ محمد ابراہیم ذوق ملازم نواب رامپور راقم نے اس شخص کو دہلی میں دیکھا ہے"

دوسرا کوئی ہوتا تو عمر بھر نساخ کی صورت نہ دیکھتا مگر داغ نے نساخ سے دوستی کر لی اور یہ دوستی اتنی بڑھ گئی تھی کہ اُن سے اپنے اور حجاب کے درمیان ثالثی کا کام تک لیا ہے یہ کمال داغ میں تھا اور یہی ان کی کامیابی کا باعث ہوا، اجنبی اور غیر کو دوست بنانا تو معمولی بات تھی وہ دشمن کو بھی دوست بنا لیتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ باوجود سارے انتظامات کے داغ کلکتہ نہ جاسکے اس لئے انہوں نے اپنے ہمراز شاگرد قطب الدین اشک کو کلکتہ بھیجا تاکہ سمجھا منا کر رامپور لاسکیں مگر حجاب ٹس سے مس نہیں ہوئی، البتہ قطب الدین نے کلکتہ سے آتے آتے ملکہ جان کی مثنوی لادی جسے دیکھ کر داغ نے ۱۳ر مارچ ۱۸۸۲ء کو ملکہ جان کو ایک خط لکھا :-

"ملکہ اقلیم سخنوری بنارس کی صنم کلکتہ کی پری دام جمالہا دکمالہا ! کیوں جی خدا نے مجھے کیوں عاشق مزاج بنایا ؟ اس بلا میں کیوں پھنسایا ؟ پتھر کا دل لوہے کا جگر کیوں نہ بنایا ؟ جس میں کوئی اچھی ادا دیکھی طبیعت لوٹ ہو گئی خصوصاً کوئی معشوق خواندہ ہو اور شعر گو بھی ہو تو مرزا داغ کی موت ہے زیادہ داغ کے

مطالعہ سے کیفیت معلوم ہوئی ہوگی! ؎

رحم آتا ہے اپنی حالت پر پڑیں پتھر بتوں کی چاہت پر

میر قطب الدین اشات کو منی بائی کی مزاج پرسی کے لئے کلکتہ بھیجا تھا اب جو وہ وہاں سے واپس ہوئے تو تمہارا سندیسا لائے مثنوی جو عنایت ہوئی اس کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں، بغیر ملاقات کے اس کی پوری داد نہیں دے سکتا۔ اس بحر میں مثنوی شاذ و نادر ہی دیکھی گئی بلا کی شوخی ہے آفت شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہے، از زبان ہندوستانی قوم انگریزی یہ دمریزی تصنیف لاجواب ہے میں حیران ہوں کہ تم نے مجھے کیوں کر جانا اور جانا تو اس قدر جانا یہ خدا جانے کہ اچھا یا بُرا جانا اس کو تمہارا ایمان جانے ایک مدت سے تمہاری شہرت سنتے سنتے کان بھر گئے تھے خصوصاً آغا مرزا شاغل نے تو چوتھے آسمان پر بٹھا دیا تھا۔

آہا! یہ تو کہئے میں نے سنا ہے کہ منی بائی سے بڑے ربط و ضبط ہیں خدا خیر کرے بارے میری برائی اور کوسنے میں تو تم شریک نہ ہوتی ہوگی بغیر یہ صبر خالی نہ جائیگا ہم بھی سہاگ بھاگ گاتے ہیں گو ہر جان کو ہمارا سلام کہہ دینا یقین ہے کہ یہ بھی لکھی پڑھی ہوں گی۔ ؎

این خانہ تمام آفتاب است"

یہ ابتداء تھی اس کے بعد مسلسل خط و کتابت ہونے لگی چنانچہ ۹ / اگست ۱۸۶۶ء کو یہ خط لکھا:۔

" دلربا عشق آرا حور لقا پری ادا، دام جمالها وکمالها۔

تمہارا پہلا خط جو ایک دفتر شکر و شکایت مجموعۂ رشک و رقابت تھا میرے پاس پہنچا، اس کا جواب مناسب میں نے تمہارے مکان پر بھیجا اور نہ پہنچا بڑے افسوس

کی ذات ہے، نہایت بدانتظامی اور کم توجہی گوہر جان کی منظور رہے ۔

مسودہ کیسا، قلم برداشتہ خط لکھتا ہوں آج تمہارا دوسرا خط آیا اس سے معلوم ہوا کہ وہ خط جن اڑا لے گئے۔ پریوں کے پاس جن ہوا کرتے ہیں کیا عجب ایسا ہی ہوا ہو مگر ایسی جگہ آدمی کی مٹی خراب ہے خصوصاً مجھ سا بھولا بھالا انسان کیا کرے؟ اس خط کے عوض کاش مجھ کو ہی اڑا کر لے جاتے، پہلے خط کے جواب میں بہت کچھ لکھا تھا مگر اب یاد نہیں رہا، تمہارے خط کے گوشے پر بنارس کے جلے ہوئے مردے کی تصویر تھی کہ جس سے میں ڈر گیا تھا اور میں نے تمہاری تصویر اور یہی چند تصویریں محمد وزیر سے بہ قیمت طلب کی تھیں انہوں نے اس روپ میں درشن دیئے ۔

جیسا دو ویسا پاؤ، تمہاری عنایتِ غائبانہ کا میں نہایت شکر گزار ہوں، اس زمانے میں کون کسی کو یاد کرتا ہے، دل ٹوٹ گیا جی چھوٹ گیا ملکہ جان! تھوڑا سا حال اپنا لکھ کر تم کو اطلاع دینی ضرور جانتا ہوں، کان رکھ کر سنو! الحمدللہ کہ مجھ کو خدا نے عالی خاندان میں پیدا کیا، دلی میرا وطن ہے جب وہ برباد ہوئی تو احتیاجِ روزگار ہوئی رامپور میں نوکر ہوں، رطب و یابس اللہ تعالیٰ گزارتا ہے چالیس پچاس آدمیوں کا رزق خداوند کریم دیتا ہے، رئیس میرا قدردان ہے اور ہم عمر و ہم وطن منفعت دنیا پر اگر نظر کرتا تو بہت کچھ پیدا کر لیتا ہندوستان میں کون سی جگہ ہے جہاں اس عاجز کی طلب نہ ہوئی مگر اپنا یہ حال ہے ؎

کرا دماغ کہ از کوئے یار برخیزد
نشستہ ایم کہ از ما غبار برخیزد

کاروبار ریاست اس قدر سپرد ہیں کہ جس سے مرنے کی بھی فرصت نہیں، حجاب

ے جو دل لگی ہو گئی تھی ایک داستان طول طویل ہے اکثر وہ حال تم کو مثنوی فریادِ داغ
سے ظاہر ہوا ہوگا، مگر موقع نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ اس شخص کا میں نہایت ممنون ہوں
اس رامپور میں تلوار کی دھار پر مجھ سے ملی اور اس ملاقات کو ایک آدمیت اور
اطاعت کے ساتھ بے غرضانہ نکلنے تک نباہا، اس ملاقات کی شہرت نے کیا
رسوائی تمام ہندوستان میں ہوئی مگر جدائی بھی ایسی ہوئی کہ ملاقات کی امید نہ رہی
میں ایک ریاست کا نوکر اہلکار کلکتے میں ہمیشہ کیوں کر رہ سکوں اتنی مقدرت
کہاں سے لاؤں؟ ترکِ روزگار کیونکر ہو سکے، یہ وسیلۂ آبرو اور حیلۂ معاش ہے
بائی جی کو یہ ضد ہوئی کہ تمام عمر رامپور کی صورت نہ دیکھوں ورنہ ممکن تھا برس دن میں
دو چار مہینے کو وہ ہمیشہ آ کر مل جایا کرتیں اگرچہ ہم غریب آدمی ہیں مگر ایسا بھی
نہ ہوتا کہ ان کی مہمانی نہ کر سکتے، بارہا انہوں نے بلایا مگر میں نے جانا مناسب نہ
جانا کہ مبادا کوئی صدمہ اٹھاؤں، میرا صدمہ اٹھانا فتنۂ محشر کا اٹھنا ہے نہ ادھر کا
رہوں نہ اُدھر کا رہوں بارہا میں نے ان کو ملنے کے لئے بلایا لکھتے لکھتے انگلیاں
گھس گئیں، دفتر سیاہ ہو گئے مگر وہ نہ آئیں مجبوراً ایک زمانۂ دراز کے بعد اپنے
دل بہلانے کی صورتیں بہت سی نکال لیں اور وہ بھی آلِ احمد صاحب کی پابند
ہو گئیں یاس کلی ہوئی۔

میرے خمیر میں عشق ہے میں وفا کا پتلا ہوں جو مجھ سے ملا اور مل کر چھوٹا یاد
کرتا رہا، اس صورت میں بھی ملاقات کا لطف ہے اب تک کوئی آدمی مجھ کو مہربان
مزاج داں نہ ملا، کہ حجاب کا داغ داغ کے دل سے مٹا دیتا بہت تلاش کی
اور ہے اور رہے گی، تم کو ایک وضع دار سنا تھا کہ اس کا ثبوت میں نے نامہ ہائے

دلوانے پایا گیا، دنیا میں ایک سے ایک اچھا ہے نہ مرزا داغ پر موقوف نہ حجاب پر منحصر ہے

داغ اک آدمی ہے گرما گرم
خوش بہت ہونگے جب ملیں گے آپ

مجھ کو تمہارے ملنے کا شوق تم سے زیادہ پیدا ہوا کیوں کہ ہنوز دل سے دل کو راہ ہے ہرچند کہ کلکتے کی آب و ہوا مجھ کو موافق ہے مگر وہاں جانا مجھ کو دشوار معلوم ہوتا ہے حیران ہوں کہ تم سے کیوں کر ملوں اور کہاں ملوں ہاں اگر تم ملنا چاہو تو سو طرح مل سکتی ہو میں بے اختیار محض ہوں میری تمہاری خط و کتابت کا حال منی بائی کو کسی طرح ظاہر ہو گیا کہ ان کا بڑا عتاب نامہ میرے نام آیا ہے، یہاں کی دل لگی سے ان کو چنداں بحث نہیں مگر کلکتہ کا رشک گوارا نہیں کر سکتیں یہ کیوں کر ہو سکے کہ تم عنایت سے یاد کرو میں اس کا جواب نہ لکھوں ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے تو بھی سر رشتۂ تہذیب و آدمیت ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے گا۔ ان کو ہم نے صاف لکھ دیا ہیں وہ مظلوم ہو کہ اگر میرے حال پر رحم کروگی تو کھڑی بہشت میں جاؤگی اُس کا خط پتہ ضرور لگانا آئندہ اپنے خط پر اپنے دستخط بھی کرنا کہ قابل اعتبار ہو، میرے لائق جو کام ہو اس سے ہمیشہ یاد و شاد فرماتی رہو اپنے وزیر کو سلام کہہ دینا اور تصویروں کا پیام"۔

اس طرح داغ نے ملکہ کو حجاب کی جگہ 'خدمت معشوقی' مقرر کرنا چاہا مگر ملکہ بھی ایک ہی کائیاں تھی بڑی ہی طرار اور گرگ باراں دیدہ وہ بھلا اس جال میں کیا پھنستی، ملکہ جان بڑی مشہور طوائف تھی اس کی بیٹی گوہر جان بھی بڑی ہی خوبصورت اور بہترین گانے والی تھی، والیان ریاست اور صاحب لوگوں سے تعلقات تھے اور یہ دونوں ماں بیٹی بڑے

جیتے جی کو بھاتی رہی تھیں، ملکہ شاعرہ بھی تھی اس کا ایک دیوان اور ایک مثنوی چھپ چکی ہے

ملکہ جان کے موجودہ خط سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ داغ حجاب کو صبر کر چکے تھے اور دل بہلانے

کی دوسری صورتیں بھی انہوں نے تلاش کر لی تھیں اس طرح وہ آہستہ آہستہ حجاب کو بھول

چکے تھے ادھر چونکہ حجاب بھی کسی آل احمد کی پابند ہو چکی تھی اس لئے وہ بھی انجان تھی اس

طرح وہ شورو اشوری اب نہ تھی بلکہ بے تکی پیدا ہو گئی تھی ۔

اگرچہ کچھ کسک باقی بھی تھی تو خلد آشیان نواب صاحب رامپور کی وفات نے جو

۲۳؍مارچ ۱۸۸۷ء کو ہوئی داغ کی دنیا ہی نہ صرف بدل دی تھی بلکہ سر میں جو سودائے عشق

و عاشقی تھا نکال دیا تھا، دار السرور رامپور، دار المحن بن گیا ایک ایک کر کے سب مشاہیر

کھسک گئے داغ بھی ۲۸؍دسمبر ۱۸۸۷ء کو ہمیشہ کے لئے رامپور چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور

اس کے بعد انہیں پریشانیوں نے گھیر لیا اور حجاب تو حجاب وہ اپنے آپ کو بھی بھول گئے

۱۸۸۸ء میں حیدرآباد آئے پھر دہلی گئے اور وہاں سے پھر حیدرآباد آکر مستقل طور پر

حیدرآباد ہی میں رہ گئے جب حیدرآباد میں عروج حاصل ہوا تو پرانے دوست احباب عزیز

اقارب سب سے خط و کتابت شروع کی اس طرح حجاب سے دوبارہ مراسلت کا آغاز

ہوا۔

داغ کے روزنامچہ میں ۱۲؍مارچ ۱۸۹۸ء کا حال لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ داغ کو

ایک مہینے کے بعد منی بائی کا یہ خط آج ملا جو ۸؍مارچ ۱۸۹۸ء کا لکھا ہوا تھا اتفاق سے

روزنامچہ نگاروں نے اسے نقل بھی کیا ہے :

"حاجی صاحب! تسلیم۔ آپ کہتے ہوں گے منی مر گئی یا پیمان بھول گئی؟ یہ سب

کچھ نہیں، نہ مری ہوں اور نہ آپ کو بھول سکتی ہوں ایک عشرے سے زائد ہوا بھن

یکایک بیمار ہوگئی معمولی بخار تھا اس نے سرسامی صورت اختیار کرلی، سارا گھر پریشان تھا، میں اس کی تیمارداری میں لگی تھی، آج شیخ جی نے آپ کا اشتیاق بھرا خط دیا اسی وقت یہ چند جملے لکھ کر روانہ کرتی ہوں۔ آپ مطلق وہم دل میں نہ لائیں ذرا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں بیمار کا حال اب بہتر ہے حکیم صاحب کی خاص توجہ ہے، آپ کا خط آتے آتے وہ یقیناً چنگی ہو جائیں گی۔"

راقمہ منی از کلکتہ ۱۰ مارچ ۱۸۹۸ء

دسمبر ۱۸۹۹ء میں داغ حضور غفران مکان میر محبوب علی خاں بہادر شاہ دکن کے ہم رکاب کلکتہ گئے وہاں ان کے پرانے دوستوں نے ملاقات کی اور ان کی شان و شوکت عزت و حرمت، دولت و حشمت سبھوں نے دیکھی، ان دنوں حجاب کسی سے نکاح کر کے بڑی پردہ داری سے بسر کر رہی تھی۔ مگر گاہے ماہے داغ کو حاجی صاحب سمجھ کر خط ضرور لکھا کرتی تھی یہ چوباتیں کلکتہ والوں کی زبانی معلوم ہوئیں تو حجاب نے بھی دوڑے ڈالنا شروع کیا، قاضی عبدالمجید کلکتہ کے ذمی تھے جو اپنے آپ کو محمڈن میرج رجسٹرار کہتے تھے ان کے توسط سے ریشہ دوانی شروع ہوئی چنانچہ داغ کا ایک خط جو بلا تاریخ ہے رامپوری مسودات میں نظر آتا ہے یہ خط قاضی عبدالمجید کے نام ہے۔

"مصدر لطف و کرم جناب قاضی صاحب! السلام علیکم، آپ کا تحریر کرنا کہ حجاب آنا چاہتی ہیں لیکن دوسرے مانع ہیں دل کو نہیں لگتی، بھلا کوئی دل سے چاہے اور پھر بھی موانعات حائل ہوں سمجھ میں نہیں آتا نہیں شاید کچھ تردد اور تکلف ہے مجھے ذرا تفصیل سے لکھئے کہ ان کا مدعا کیا ہے، میری جو حالت ہے آپ پر ظاہر ہے سب بتا چکا ہوں نہ میں وہ رہا اور نہ اب وہ پہلے جیسی رہیں۔ ایک قدیم خلش ہے جو بے چین بنائے ہوئے ہے، وہ چلی آئیں تو وقت خوش گزرے گا ورنہ ویسے کچھ نہ کچھ دلچسپی

کا سامان بہم ہی رہتا ہے، ان سے کہہ دیجئے کہ گو میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ لیکن ان کی لگن ویسی ہی تر و تازہ ہے میں انہیں امکان بھر ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں بشرطیکہ مجھے یقین ہو جائے کہ وہ خود بھی دل سے میرے پاس آنا چاہتی ہیں، ہر رکاوٹ دور ہو سکتی ہے بُعد قرب ہو سکتا ہے اگر وہ چاہیں" (بلا تاریخ)

اس خط میں داغ نے صاف لکھ دیا ہے کہ وہ فقط یہ چاہتے ہیں کہ:-

"وہ چلی آئیں تو وقت خوش گزرے گا"

اس میں قدیم خلش کا حوالہ محض وضع داری ہے اس طرح داغ نے اپنی حالت صاف صاف ظاہر کر دی ہے اور پھر اس کے بعد ایک اور خط بھی لکھا ہے، قاضی صاحب نے چونکہ چھیڑ دیا تھا اس لئے داغ سراپا سانہ ہو گئے سارے تار جھنجھنا اٹھے، دیکھئے کس مزے سے لکھتے ہیں:-

"آپ نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ کوئی بات ہی تو ہے جو داغ اس عمر میں ان کے لئے گھلا جاتا ہے ہر وقت انہیں میں دھیان رہتا ہے، یک خلش ہے کہ چلی جاتی ہے ایک پھانس ہے کہ دل میں کھٹکتی رہتی ہے، جس وقت گزرا ہوا زمانہ تصور میں جمتا ہے قیامت گزر جاتی ہے، قاضی صاحب! شاید آپ اس کیفیت کو محسوس نہ کریں جو عاشق مزاج ازلی ہو حسن و جمال کو دیکھ کر جیتا ہو اس سے یہ نہ پوچھئے کہ حجاب کے لئے کتنا اشتیاق اپنے دل میں رکھتا ہے، میں چشم براہ ہوں جلد یہ لکھ کر خوش کیجئے کہ وہ اب آنا چاہتی ہیں آخر یہ دیر کیا ہے ان سے کہہ دیجئے کہ وہ یک جنبش دو دو گوش چلی دیں بہر حال اور ہر رنگ میں ان کا منتظر ہوں" (بلا تاریخ)

اسی کے ساتھ حجاب کو بھی ایک خط لکھا ہے جو ہمیں مسودات رامپور میں ملا ہے یہ بلا تاریخ ہے:-

"ہائی جی! غضب تو یہ ہے کہ وہ بیٹھی ہیں پاس ہوتیں تو سیر ہوتی تمہارے گرد گھومتا اور شعلہ جوالہ بن جاتا کبھی تمہیں شمع قرار دیتا اور پتنگا بن کر قربان ہو جاتا کبھی بلائیں لیتا اور

کبھی صدقے ہو جاتا ایک خط بھیجا ہے ابھی اس کے انتظار کی مدت ختم نہیں ہوئی کہ دوسرا
خط لکھوانے لگا خدا کے واسطے جلد آؤ یا تاریخ آمد مقرر کر کے اطلاع دو شب و روز
انتظار میں گزرتے ہیں، وہاں کے لوگ کیوں کر خوشی سے اجازت دیں گے تم ہی چاہو گی تو
روانگی ہو سکے گی، میں تمہارے لئے بلبلا رہا ہوں یہ خوفناک کالی کالی راتیں اور تنہائی،
کیا کہوں کیوں کر تڑپ کر صبح کی صورت دیکھتا ہوں یقین جانو ایسے تڑپتا ہوں جیسے
بلبل قفس میں میرے دونوں خطوں کے جواب آنا ضرور ہیں۔"

۱۷ رجولائی سنہ ۱۹۱۰ء کے روزنامچے میں اسی تاریخ کا آیا ہوا احباب کا ایک خط نقل ہوا ہے:۔

"حاجی صاحب! السلام علیکم! بعد شوق ملاقات عرض پرداز ہوں کہ آپ کا
محبت سے لبریز خط ملا، آپ بلائیں اور میں نہ آؤں میری کہاں مجال اور مجھ میں کہاں اتنی
طاقت کہ غلط عذر کر سکوں مگر بعض مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان جو چاہتا ہے وہ
نہیں کر سکتا، میں لاکھ چاہتی ہوں کہ مجھے یہاں کے جھمیلوں سے نجات ملے اور میرے
پر لگ جائیں اور آپ تک پہنچ لوں مگر مجبوریوں کا خدا بھلا کرے کہ وہ ایسی میری روانگی
میں حائل ہیں کہ کچھ کرتے دھرتے بن نہیں پڑتی، آپ ہیں کہ برابر مجھے بے مروتی اور
بے رحمی کے طعن و تشنیع سے چھلنی کئے ڈالتے ہیں، میرے ہر عذر کو بہانا خیال کر کے
شک کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں، واقعات جو ہیں وہ من و عن میں خود اور حکیم
صاحب آپ کو لکھ چکے ہیں میں ان کا بار بار ذکر کیا کروں، آپ کی عقل کہاں گئی ہے؟
آپ کی ہوشمندی کدھر سو رہی ہے! سوچ سمجھ کر عقل کی جاتی ہے! اچھا میرے کام

ہیں وہ وقت آیا ہی چاہتا ہے کہ آپ میرے اور میں آپ کے سامنے موجود ہونگی ۔
آج دو روز سے مجھے زکام شدید ہو گیا ہے، ناک بُری طرح بہتی ہے یہ خط مشکل
سے لکھ پایا ہے یقین ہے کہ آپ بالکل خیریت سے ہوں گے ، آپ نے یہ کیا لکھ دیا
کہ بجز غمِ فراق کے سب خیریت ہے ، مجھے آپنے ایک دفعہ بھی نہیں لکھا کہ یہ درد نقرس
کے بار بار دورے کیا معنی رکھتے ہیں ، حکیم صاحب والے خط سے مجھے معلوم ہوا
خدا کرے اب آپ بالکل صحیح ہوں ، یہاں سب خیریت ہے اور پرسان حال سلام عرض
کرتے ہیں " فقط ۔ "آپ کی منی"

روزنامچہ میں داغ کے ایک خط کی نقل ہے جو ۱۰؍ دسمبر سنہ ۱۹۰۱ء کو حجاب کو لکھوایا گیا ہے :-
" دشمنِ جانی ! سلام شوق ، عین انتظار میں تمہارا محبت نامہ دستیاب ہوا کئی بار
پڑھا آنکھوں سے لگایا چوما اور چھاتی پہ دھرا رہا تم لکھتی ہو مجھے بھول جاؤ اور اگر نہ
بھولو تو بدل جاؤ یہ کر لو گے جب ہی تمہارے پاس آؤں گی ، خوب تم کو میں بھول
جاؤں ؎

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ نادان کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

اچھا تم یہاں آجاؤ پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو بھولنے کی کوشش کریں گے ۔
مجھے تمہاری ہر بات منظور ہے جواب میں لکھو کب آ رہی ہو ؟"

لوگ یہ نہ سمجھیں کہ داغ واقعی حجاب کے عشق میں مبتلا تھے اور اس کو بلانے
کے لئے بے چین ! یہ صرف دل لگی تھی ورنہ انہیں فقط خوش گزرانی مقصود تھی ، حجاب کو یہ خط
لکھوائے پورے چار روز بھی نہ گزرے تھے کہ نوح ناروی الٰہ آباد سے آگئے اور آتے
آتے ایک خوبصورت طوائف کی تصویر لائے جو داغ کے نذر کی ، اسے دیکھتے ہی داغ

بے چین ہو گئے اور اسی روز یعنی ۱۵ دسمبر ۱۹۰۱ء کو منی جان کو یہ خط لکھوایا :-

"حور کی صورت ، نور کی مورت یا خوش رہو اور ہم سے ملو اکل محمد نوح صاحب تشریف لائے آج برسبیل تذکرہ تمہاری طرف سے ہمارا ایک ہدیہ پیش کیا یعنی تمہاری تصویر ، تصویر نہیں بلکہ تیر نام پوچھا تو سن کر خواہ مخواہ ایمان لانا پڑا (منی جان بتقدیم نون) بار خدایا ایسی صورت بھی تو نے پیدا کی ہے ، سیرت کی تعریف سنی تو صورت سے بڑھ کر ، خوش آواز خوش مزاج اور پھر لکھی پڑھی ، زمانہ ایسے لوگوں کی جتنی قدر کرے بجا ہے ۔

بت ہی پتھر کے کیوں نہ ہوں اے داغ
اچھی صورت کو پوجتا ہوں میں ،

کیوں جی ! تم سے کیوں کر ملیں تم کو کیوں کر دیکھیں کیوں کر سنیں ؟ اور نہ دیکھیں تو کیوں کر جئیں ؟ جو شخص ازلی عاشق مزاج ہو خیال کرو اس کا کیا حال ہوگا ، تم سے یہ امید نہیں کہ خواب میں بھی آؤ ہائے مجبوری وائے مہجوری ....

کیا بات ہے کیا گھات ہے اللہ رے شریر ۔ سوجھی ہے نئی طرح کی تجھ کو تدبیر
کب دیکھنے والوں پہ کھلا دل کا حال ۔ چھپائی ہے کیا سینہ چھپا کر تصویر

(انشائے داغ صفحہ ۶۶-۶۷) ۔

۲۵ ، دسمبر ۱۹۰۱ء کے روزنامچے کی عبارت ملاحظہ ہو :-

"آج مغرب کے وقت حسب معمول محفل آراستہ تھی صدر میں ایک طرف مرزا صاحب بیٹھے تھے حقے کی نے منہ سے لگی تھی روزمرہ کے حاضر باش شاگرد تشریف فرما تھے میں بھی حاضر تھا فرمانے لگے کیوں جی ، منی بائی کو عدت میں بیٹھنا ہوگا ؟ لوگوں نے کہا کیوں

نہیں ہوئے دس برس میں بھڑوے سے کچھ نہ ہُوا تو عین طلاق کے زمانے میں کیا اس سے کچھ ہو سکا ہوگا، بھائی مجھ سے تو یہ نہ ہوگا کہ انہیں عدت میں بٹھاؤں، میرے نزدیک بائیس برس تک وہ عدت میں بیٹھی رہیں اب آخر کب تک عدت میں رہیں گی؟"

یہ واقعہ لکھ کر روزنامچہ نگار نے اس پر حاشیہ آرائی کی ہے،

"منی بائی یا منی جان حجاب تخلص جن پر مرزا صاحب رام پور میں عاشق ہوگئے تھے وہ اب تشریف لا رہی ہیں مرزا صاحب بڈھے ہوگئے ہیں لیکن جوانی کا سا ولولہ ابھی موجود ہے، پرانی محبت پھر جوش پر آئی ہوئی ہے چند برس سے بی منی نے کسی صاحب جتنے نام سے عقد کر لیا تھا، منی بائی اور مرزا صاحب کے کلکتہ کی ملاقات کے بعد سے خط و کتابت کا برابر سلسلہ جاری تھا لیکن اس دوران میں ملاقات نہ ہو سکی پرانے لوگوں میں وضع داری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی مرزا صاحب بھی اس سے خالی نہیں، منی بائی کی محبت اب تک رگ و ریشہ میں سمائی ہوئی ہے خطوط میں کبھی کبھی القاب دشمن جانی لکھا کرتے ہیں اور منی بائی مرزا صاحب یا حاجی صاحب لکھا کرتی ہیں مرزا صاحب کی سچی محبت نے منی بائی کے دل پر وہ اثر کیا کہ انہوں نے جتنے صاحب سے طلاق لے لی ہے اور مرزا صاحب کو خط لکھا ہے کہ میں آ رہی ہوں دو چار روز ہوئے خط آیا ہے مرزا صاحب بہت خوش ہیں اکثر و بیشتر اسی کا ذکر رہتا ہے۔"

(روزنامچہ قلمی)

۳۰ دسمبر ۱۹۰۱ء کے روزنامچے میں احسن مارہروی نے لکھا ہے :-

"منی بائی حجاب جن کی جلوہ نمائی مثنوی فریادِ داغ کے پردے میں پھیلی ہوئی ہے ایک مدت مدید کے بعد کلکتہ سے حیدرآباد آنے والی ہیں مرزا صاحب ۲۵ - ۳۰ برس سے مختلف تدبیریں ان سے ملنے کی کر رہے تھے اب بشرائط چند وہ ان کے پاس آنے پر

رضامند ہوئی ہیں پھر بھی مرزا صاحب کو والماز شبہات سے تھوڑی بہت بے اطمینانی باقی ہے کل دیوانِ حافظ سے فال نکالی گئی کہ حجاب کلکتے سے حیدرآباد آئیں گی یا نہیں مغرب کی نماز پڑھ چکے تھے خاص خاص بے تکلف احباب و شاگرد جمع تھے حکم ہوا دیوان حافظ لاؤ دیوان لایا گیا، مجھ سے بولے احسن تم سید ہو اور حافظ ہو فاتحہ پڑھ کر خواجہ حافظ کی روح کو ثواب پہنچاؤ، اور کتاب کھولو، میں نے تعمیل حکم کی، کھولتے ہی پہلا شعر یہ نکلا، ؎

درکار گلاب و گل حکم ازلی ایں بود
کاں شاہد بازاری ویں پردہ نشیں باشد

لسان الغیب کی اس عقدہ کشائی نے مرزا صاحب کو بے حد مسرور کیا ایسی صریح صراحت کے بعد کسی اور شگون کے لینے کی ضرورت نہیں تھی مگر مشتاق و بے صبر عاشق مزاج کو چین کہاں، رمل کے پانسے نکالے گئے اور ہاتھ لگا کر پانسوں کو پھینکا گیا اور حساب لگایا گیا تو یہ جواب آیا "حجاب آنے کو ہیں مگر روپیہ نہیں"۔

(روزنامچہ قلمی)

۸ جنوری ۱۹۰۲ء کے روزنامچہ میں حجاب کا ایک خط نقل ہوا ہے جو اسی روز داغ کو ملا تھا۔

"حاجی صاحب زاد لطفہ! بعد آداب کے عرض رساہوں کہ خط آپ کا ملا میرا آنا تو قطعی ہے لیکن جب تک نکاح نہیں کروں گی تمہارے سامنے نہیں آؤں گی، میں نے یہ تمام جھگڑے اس لئے نہیں کئے ہیں کہ شرعی باتوں کے خلاف کروں۔ تم اس بھروسے میں نہ رہنا کہ میں تمہارے سامنے آؤں میرے لئے علیحدہ مکان لینا اسی میں اتروں گی اور جب تک قاضی صاحب نکاح نہیں پڑھائیں گے اس وقت

تک تم میری صورت دیکھنے کے مجاز نہیں ہو۔“

اس خط کو نقل کر کے احسن صاحب (روزنامچہ نگار) نے لکھا ہے:-

”خط سن کر مرزا صاحب بولے بہت اچھا ایسی ہوچیاں اڑائی ہوں کہ وہ بھی خوب یاد کریں، دیکھو بھائی! وہ جب تشریف لائیں مجھے ایسی جگہ چھپانا کہ وہ ڈھونڈیں بھی تو نہ پائیں مگر بھائی! حجاب ایک بڑی چلتی ہوئی عورت ہے مجھے تو یہ ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسری عورت اس پردے میں مجھ سے نکاح نہ پڑھوا لے، جب انہوں نے مجھ سے یہ شرط کی ہے کہ جب تک نکاح نہ ہوگا اس وقت تک سامنے نہیں آؤں گی تو میں کیسے جان سکتا ہوں کہ میری بی بی منی بائی حجاب ہیں گی، اس لئے مناسب ہے کہ جب تک وہ اپنا یہاں حیدرآباد میں کھنچوایا ہوا فوٹو نہیں دیں گی اس وقت تک میں قبول نہیں کر سکتا، کچھ دیر توقف کر کے فرمایا تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ منی بائی صوم و صلوٰۃ کی پابند ہیں ہر سال رجب سے رمضان تک مسلسل روزے رکھتی ہیں اگر یہی حال رہا تو برس دو برس میں ولی ہو جائیں گی، یہاں ان کے لئے ایک جانماز اور تسبیح تیار رکھو جس وقت وہ یہاں اتریں فوراً ان کی نذر یہ چیزیں کی جائیں۔“

خدا خدا کر کے ۱۸ یا ۱۹ جنوری ۱۹۰۲ء کو حجاب حیدرآباد پہنچیں ۳ جولائی ۱۸۸۲ء کو داغ نے حجاب کو کلکتہ میں اس کے گھر پہ خدا حافظ کہا تھا اور اب ساڑھے انیس سال بعد حجاب کا خیر مقدم داغ نے اپنے گھر پہ کیا۔ بظاہر یہ ۱۹½ سالہ طویل عاشقی لوگوں کو عشق صادق کا یقین دلاتی ہے مگر یہ صرف وضع داری اور دل لگی تھی اس جذبۂ تفریح کو محبت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا، دونوں طرف ایک ہی جذبہ کار فرما تھا، داغ فقط خوش گزرانی اور دل لگی چاہتے تھے اور حجاب ان کی دولت بٹورنا چاہتی تھی اسی زمانے

کے لئے داغ نے یہ شعر کہا تھا:

تمہیں ناز ہو نہ کیوں کر کہ لیا ہے داغ کا دل   یہ رقم نہ ہاتھ لگتی نہ یہ افتخار ہوتا"

۲۲ر جنوری سنہ ۱۹۰۲ء کے روزنامچہ میں لکھا ہے:

""منی بائی آج چار روز ہوئے کلکتہ سے تشریف لائی ہیں، ایک طوائف کی ایسی دنیا بدلی ہے کہ کوئی وقت وظیفے سے خالی نہیں ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ صوم وصلوٰۃ کی پابندی پانچ چھ برس سے ان کی گھٹی میں پڑ گئی ہے ہر سال رجب سے رمضان تک مسلسل روزے رکھتی ہیں ان کی اس حالت کو دیکھ کر مرزا صاحب فرما رہے تھے کہ دو چار برس میں ولیہ ہو جائیں گی۔"

"منی بائی جب حیدرآباد وارد ہوئیں جو سب سے پہلی چیز ان کو پیش کی گئی وہ ایک جانماز اور تسبیح تھی جس روز سے منی بائی تشریف لائی ہیں مرزا صاحب کی زبان پہ ان کی زہد کا ذکر ہے آج فرما رہے تھے میرے گھر میں فرشتن آئی ہیں، آسمان پر شور مچا ہوا ہے، اللہ میاں کے پاس فرشتے فریادیں کر گئے کہ آدمی ہیں اے خدا تو نے عبادت کی ایسی طاقت کب دی تھی پھر کیا وجہ ہے کہ داغ کے گھر میں ایک عورت ایسی آئی ہے جو ہم سے بھی سبقت لے گئی ہے، مرزا صاحب اس ضمن میں یہ بھی بولے کہ میں نے بی حجاب سے کہہ دیا ہے کہ نماز کے سوا جب تک تمہارے وظیفے وظائف نہیں چھوٹیں گے اس وقت تک تم انسان نہیں بن سکتیں اور جب تک انسان نہ بن سکیں اس وقت تک میرے کام کی نہیں ہو سکتیں۔ بہرحال تم یاد رکھو رفتہ رفتہ تمہارے سب وظیفے چھڑا دوں گا اور تم کو خالی نماز پر اکتفا کرنا ہوگا۔"

۲۳ر جنوری سنہ ۱۹۰۲ء کے روزنامچہ کی نقل بھی ملاحظہ کیجیے:

"ڈاکٹر احمد علی حیدرآباد میں ایک فوجی ڈاکٹر ہیں آج شام کو ہم بیٹھے تھے کہ مرزا صاحب

کی خدمت میں حاضر تھے اتنے میں ڈاکٹر صاحب موصوف تشریف لائے مرزا صاحب ان سے بولے حضرت ہمارے یہاں بی فرشتن آئی ہوئی ہیں، مرزا صاحب کی ماما کسی کام سے اسی وقت باہر آئی ڈاکٹر موصوف نے کہا کیا یہی فرشتن ہیں مرزا ہنس کر بولے نہیں یہ تو چڑیل ہے اس کے بعد منی بائی کا ذکر ہونے لگا مرزا نے بتایا کہ وہ دو تین سال کامل اجمیر رہی ہیں چلہ کشی بھی کی تھی کہ دل مراد دل میں ہو گی ایسی قلب ماہیت ہوئی کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ نماز روزہ کیسا کیسی تھیں اور اب یہ حال ہے کہ ہر وقت نماز اور تسبیح، مصلے پر بیٹھی ہوئی ہیں کون سی نماز ایسی ہے جو نہ پڑھی جاتی ہو ایک بے تکلف نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ حضرت آپ ان سے شادی کریں گے انہوں نے جواب دیا کہ بھائی مجھے معلوم نہیں بائیس برس کے بعد تو یہ دن نصیب ہوا ہے میں تو راضی ہوں مگر وہ ابھی راضی نہیں ہیں بہرحال ؎ راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں

اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

اسی صحبت میں ایک بے تکلف نے کہا کہ حضرت آپ کی عمر بہتر سال کی ہو چکی ہے اب کس برتے پر عقد کا ارادہ رکھتے ہیں اور ایسے نکاح سے فائدہ، مرزا صاحب نے جواب میں فی البدیہہ یہ شعر فرمایا ؎ جناب داغ اب سنبھلیں گے کیا خاک

کہ وہ بگڑے ہوئے ہیں عمر بھر کے

مرزا صاحب نے فرمایا مجھے تمام عمر میں پانچ عشق ہوئے ہیں جن میں سے دو اب تک میرے رگ و ریشے میں سمائے ہوئے ہیں ایک بی منی حجاب کا دوسرا عشق خواجہ معین الدین چشتی کا!"

۲۵ جنوری ۱۹۰۲ء کے روزنامچہ میں یہ کیفیت ہے:

"جب سے منی بائی حجاب تشریف لائی ہیں مرزا صاحب اپنے مردانہ مکان میں کم بیٹھتے

ہیں دو گھنٹے کے سوا سارا وقت حجاب کے پاس گزرتا ہے مرزا صاحب کی یہ ادا
ان کے احباب کو سخت ناگوار ہے اسی وجہ سے ان کے مخلص دوستوں کی آمد و رفت کم ہو
گئی ہے، آج بعد مغرب مرزا صاحب نے اپنے ایک دوست نواب حسن علی خاں کو جب کہ وہ
دو روز سے تشریف نہیں لائے تھے مجھ سے یہ خط لکھوایا:۔

"نواب صاحب بہادر! صاحب عالم بہادر (مرزا خورشید عالم برادر اخیافی مرزا داغ) کہتے ہیں
کہ کل صبح پتنگوں کے پیچ ہیں، بغیر آپ کی تشریف آوری کے کچھ نہیں ہو سکتا، مجھ کو خبر نہ تھی
کہ پیچ وہاں لڑیں گے اور دلوں میں پیچ مجھ سے پڑے گا، مرد خدا! یہ کیا بات ہے آپ نے
یک لخت کم کر کے کیوں ترک کر دی؟ میں نے کوئی بات بغیر آپ کے مشورے کے نہیں
کی، صحبت و قت نہیں چھوڑی جاتی، آپ کو حسب معمول روز آنا چاہئے اور ماحضر یہیں تناول
فرمانا چاہیے اور اگر تنہا کھانا کھانا گوارا نہیں ہے تو بہتر ہے نہ کھلائیے مجھ کو غم ہی نہ کھلائیے،
آئیے آئیے تشریف لائیے فقط۔"

۱۸ یا ۱۹ جنوری کو حجاب حیدرآباد آئی اور آتے ہی دوسرے تیسرے روز ہی سے
داغ پر حاوی ہو گئی سب سے پہلے تو داغ کو اندرونی زنانہ حصہ مکان میں بٹھانا شروع کر دیا،
ورنہ داغ کا معمول اپنی بیوی کی زندگی میں بھی یہ تھا کہ وہ صرف رات میں اندر جایا کرتے
تھے دن بھر باہر ہی رہتے تھے، داغ کے قدیم احباب میں نواب حسن علی خاں امیر بڑے خاص
بزرگ تھے جو داغ کے دوست اور راز دار تھے کسی معاملے میں ان سے پردہ نہ تھا، ان
کا معمول یہ تھا کہ روزانہ دس گیارہ بجے داغ کے پاس آ جاتے اور دن بھر یہیں رہتے رات کو
گھر جایا کرتے، ایک کمرہ ان کے لئے مخصوص تھا اور ان کا حقہ وغیرہ اس میں رہا کرتا تھا،
جب انہوں نے یہ دیکھا کہ وہ آ کر تنہا باہر بیٹھے رہتے ہیں اور داغ اندر حجاب کے پاس

ہی رہا کرتے ہیں تو پہلے تو انہوں نے ایک ایک دن کا وقفہ دے کر آنا شروع کیا اس پر داغ نے کوئی شکایت نہیں کی بلکہ ان کی اس ایک دن آڑی حاضری کو محسوس ہی نہیں کیا تو انہوں نے آنا ہی بند کر دیا جب دو دن گذر گئے تو داغ نے یہ خط جو اوپر نقل کیا گیا ہے انہیں لکھوایا، یہ خط ملا تو بھی نواب حسن علی خاں ٹس سے مس نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے اس خط کے جواب میں لکھا کہ مجھے اب روز کی حاضری سے معاف فرمایا جائے، یہ خط جو داغ کو ملا تو داغ کی سمجھ آیا کہ حسن علی خاں کیوں خفا ہیں، داغ کو ان سے بہت زیادہ خلوص تھا۔ اس لئے داغ نے فوراً اسکا جواب لکھا:

"نواب صاحب! آپ تو بیٹھے بٹھائے کلیجے میں نشتر چبھو دیتے ہیں یہ فقرہ کیونکر دل دوز اور جگر دوز نہ ہو کہ اب مجھے روز کی حاضری سے معاف فرمایا جائے۔ مجھ سے جو کچھ ہوا وابستہ نہیں ہوا حجاب جیسی ہزار ہوں تو تمہارے خلوص تمہاری محبت پر نثار تم سے کیا پردہ ہے اور تم سے کیا چھپا ہے تم اس پرچے کے جواب میں فوراً آؤ اور مجھ سے کچھ سنو!" بلا تاریخ۔ (خطوطِ داغ)

حسن علیخاں امیر کے داغ کے پاس جانے، حجاب کے ان کے سامنے ہونے اور پتنگ کے پیچ لڑنے کی تفصیل حسن علیخاں نے کسی وقت اپنے دوستوں کو سنائی تھی جسے اُن کے پوتے میر السبین علی خاں بی اے، (علیگ) نے جو اُن دنوں کم سن تھے سن لی تھی انہوں نے جو قصہ سنایا بڑا ہی دلچسپ ہے، عزیز موصوف کا بیان ہے کہ جب حسن علی خاں داغ کے پاس پہنچے تو داغ انہیں اندر لے گئے جہاں حجاب بیٹھی ہوئی تھی اور حجاب سے ان کا تعارف کرایا پھر حجاب سے کہا کہ اپنا ڈور، اور پتنگ وغیرہ نواب صاحب کو دکھلائے چنانچہ حجاب نے ڈور کی چرخیاں اور پتنگ انہیں دکھایا اور انہوں نے اس کی داد دی پھر دسترخوان بچھا تو صاحب عالم بھی آگئے اور انہوں نے داغ سے یہ کہہ دیا کہ نواب نے ایک غزل کہی ہے جس میں حجاب کا ذکر ہے چونکہ یہ

غزل نواب نے داغ کو نہیں سنائی تھی اور اس سے صرف صاحب عالم ہی واقف تھے اس لئے داغ نے اصرار کیا کہ غزل سنائی جائے اور حسن علی خاں نے وہ غزل سنائی، داغ نے بہت داد دی اور حجاب بھی خوش ہوئی اس کے بعد پتنگوں کے پیچ ہوئے حسن علی خاں حجاب کی طرف سے پتنگ لڑا رہے تھے اور خورشید عالم تنہا ایک طرف تھے دیر تک یا شام تک پتنگ بازی ہوتی رہی، اس طرح حجاب نہ صرف داغ سے بلکہ صاحب عالم اور حسن علی خاں سے بھی بے پردہ ہو گئی تھی،

۶ر فروری ۱۹۰۲ء کے روزنامچہ سے بڑی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں ملاحظہ ہو:۔

"آج کی صحبت میں بی حجاب کا ذکر خوب رہا مرزا صاحب کے چند بے تکلف دوست جمع تھے جو مرزا صاحب کے تمام مشوروں میں شریک ہوا کرتے تھے ایک صاحب نے ازراہ تمسخر دریافت کیا کیوں صاحب اب آپ کا سن یہ ہے کہ منہ میں بتیسی لگی ہوئی ہے، ڈاڑھی کے بال خضاب اور مہندی سے سیاہ و سرخ کئے جاتے ہیں آخر کس برتے پر آپ حجاب سے نکاح کرنے پر مائل ہیں؟ مرزا صاحب نے فرمایا کہ نکاح کرکے عام اصطلاح میں حجاب کو میں اپنی بیوی نہیں بناؤں گا بلکہ رفیق بناؤں گا، مجھے اپنی کبرسنی کا احساس ہے، منہ میں بجائے قدرتی دانتوں کے بتیسی بھی مجھے محسوس ہوتی ہے وسمہ اور مہندی بھی ہفتے میں دو بار لگتی ہے، میری مسہری بھی ایک نوعروس کی مسہری معلوم ہوتی ہے رنگین جالی کے پردے جن پر گوٹا اور ٹھپا ٹنکا ہوا ہے، انگوری بیل کی جھالر بھی لہرا رہی ہے تو پھر جب یہ سب باتیں روا ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ منی بائی حجاب میرے لئے جائز نہ کر دی جائے اس عمر میں مجھے بیوی سے زیادہ ایک ہمدرد کی ضرورت ہے میں سمجھتا ہوں پہلی بیوی، بیوی ہوتی ہے، دوسری بیوی رفیق ہوتی ہے اور تیسری بیوی درحقیقت جان کا جنجال، مرزا صاحب کی اس گفتگو نے سب کو ساکت کر دیا۔

دیکھا آپ نے داغ کا خیال حجاب کے متعلق کیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ داغ شاعر اور صرف شاعر تھے قسمت نے ان کو شاعری پیشہ بھی بنا دیا تھا ان کا کام شعر کہنا تھا اور کچھ نہیں اور شعر کہنے کے لئے جذبات کی ضرورت تھی جو ستر بہتر برس کی عمر کی وجہ سے مفقود ہو چکے تھے، اب شاعری کے لئے انہیں طبیعت میں چل اور جذبات میں ہیجان پیدا کرنا پڑتا تھا اور یہ دو باتیں بغیر مے و معشوق کے پیدا نہ ہو سکتی تھیں، شراب داغ نے کبھی نہیں پی تھی وہ بڑی شدت سے شراب کے مخالف تھے رہا معشوق سو بس شعر گوئی کے لئے اسے لگا رکھا تھا ۱۳ فروری ۱۹۰۰ء کے روزنامچے سے میرے اس خیال کی تصدیق آپ کو ہو گی ملاحظہ ہو۔

"درحقیقت مرزا صاحب بڑے شگفتہ مزاج واقع ہوئے ہیں، بڑھاپے میں جوانی کا عالم معلوم ہوتا ہے وہی مذاق وہی دل لگی، چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو پرورش کیا ہے بڑی چلبلی لڑکیاں ہیں جب ان کے پاس کوئی نہ ہوتا تو ان کو بلاتے ان سے مزے مزے کی باتیں کرتے اور وہ مرزا کا دل بہلایا کرتیں، مرزا ان سے خوب کھل کر ہنسی مذاق کیا کرتے، آج شام کو جب میں پہنچا تو مرزا صاحب انہیں رنگ رلیوں میں مصروف تھے میرے پہنچتے ہی وہ لڑکیاں ہرنیوں کی طرح چھلانگیں مارتی ہوئی گھر میں بھاگ گئیں مرزا نے مجھے دیکھ کر برجستہ یہ شعر پڑھا۔

دن گزارے عمر کے انسان ہنستے بولتے ۔۔۔ جان بھی جائے تو میری جان ہنستے بولتے

داغ کے پاس ہمیشہ ایک طوائف نوکر رہی جب وہ حیدرآباد آئے تھے ایک طوائف ان کے پاس نوکر رہا کرتی تھی اور ایک قوال بھی ملازم تھا یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ داغ ہمیشہ ایسی طوائف کو نوکر رکھا کرتے تھے جو بہترین گانے والی اور خوبصورت ہوتی تھی ان کی بیوی کی زندگی بھر طوائف نوکر رہی مگر اس جنتی بیوی نے کوئی اعتراض نہیں کیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ داغ صرف مذاق، دل لگی اور گانے کی خاطر طوائف کو نوکر رکھتے ہیں، چنانچہ

حجاب جس وقت حیدرآباد آئی ہے داغ کے پاس اختر جان ملازم تھی اور دوسری آنے والی طوائفوں کے مجرے بھی داغ سنا کرتے تھے، حجاب نے آتے ہی ان پر احتساب قائم کر دیا،

۲۷ فروری ۱۹۰۲ء کا روزنامچہ دیکھئے:۔

"مرزا صاحب ہفتے میں دو تین مجرے ضرور سنا کرتے ہیں مگر جب سے حجاب کلکتہ سے آئی ہیں۔ اُن سے پہلا معاہدہ یہ ہوا ہے کہ کوئی طوائف یہاں نہ آنے پائے آج شام کو حجاب کے بھائی خدا بخش بیٹھے تھے میں بھی موجود تھا، مرزا صاحب مخصوص خدا بخش کو چھیڑنے کے لئے اکثر طوائفوں کا ذکر کیا کرتے تھے خصوصاً اختر جان سورت والی کا ذکر ضرور کرتے تھے وہ حجاب کے آنے سے پیشتر کوئی دو برس تک مرزا صاحب کے پاس نوکر بھی رہی تھی خدا بخش کو معلوم تھا کہ میری بہن سے مرزا صاحب کا معاہدہ ہو چکا ہے کبھی کبھی خدا بخش بھی مرزا صاحب کو چھیڑا کرتے تھے آج وہ بولے کہ حضرت آج رحمت اللہ (مرزا صاحب کا گویا) کہتا تھا کہ ایک نئی رنڈی آئی ہوئی ہے حسن اور سن کے علاوہ گانا بھی اس کا لاجواب ہے، مرزا نے برجستہ جواب دیا کہ کیا تمہاری بہن سے بھی اچھی ہے؟ خدا بخش جھینپ کر رہ گئے مرزا بولے چلو آج اُسے بلا کر ہم گانا سنیں اور تم حجاب کی گالیاں سن لینا حساب برابر ہو جائے گا۔"

داغ نے بڑی خوشی سے حجاب کو بلایا تھا مگر وہ عجیب و غریب قسم کی عورت ثابت ہوئی رشک و رقابت کا جذبہ اس میں اس قدر قوی تھا کہ وہ کسی عورت سے داغ کا بات چیت کرنا تک برداشت نہ کر سکتی تھی یہ طوائفوں کے آنے اور مجرے پر اس نے احتساب قائم کر دیا تو داغ پریشان ہو گئے،

۲۱ اپریل ۱۹۰۲ء کا روزنامچہ دیکھئے،

"آج مرزا صاحب بہت سست نظر آتے تھے شام کو میر مردان علی تشریف لائے وجہ افسردگی پوچھی تو مرزا نے فرمایا جب سے حجاب آئی ہیں۔ دوسری صحبت نہیں رہی ہر اسی کر دل بہلایا کرتے تھے

دو بجے ختم، کبھی کبھی کوئی طوائف سلام کے لئے آجاتی تھی وہ بھی ان کو ناگوار ہے، بتاؤ جس شخص کی گھٹی میں حُسن و نغمہ پرستی ہو وہ کس طرح اس قید و بند کو برداشت کر سکتا ہے، بڑی دیر تک اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں، بالآخر خود سوچ کر بولے کہ اچھا یار ایک ترکیب سمجھ میں آئی اور وہ یہ ہے کہ آئندہ سے اپنے دوستوں کے ہاں مجرے ہُوا کریں روپیہ ہم صرف کریں اور نام ہو یاروں کا۔"

چنانچہ یہ تصفیہ کرنے کے بعد ہی داغ نے حسن علی خاں امیر کو ایک خط لکھا:

"نواب صاحب! بی حجاب کو اصرار ہے کہ اختر جان کو علیحدہ کر دوں اور اگر گانا سنوں تو کبھی کبھی کسی کو طلب کر کے دل بہلا لیا کروں، اختر جان کو ایک بڑی رقم پر ملازم نہ رکھا جائے اور اگر رکھا جائے تو پابند نہ کیا جائے، فرمایئے اس ضد اور ترباہٹ کا کوئی علاج ہے؟ آج دو تین روز بجھلاتے ہو گئے لیکن ارادے اور زبان میں ایسی پختہ ہیں کہ ذرا جنبش نہیں، جس روز سے یہ جھگڑا کھڑا کیا ہے مجھے گانا سننے کو نہیں ملا، دل کی عجیب حالت ہے کوئی عذر کر کے آپ کے یہاں آتا ہوں اختر جان کو بلایا ہے وہ کیا عجب کہ مجھ سے پہلے پہنچیں گانے کا بندوبست آپ کے یہاں ہو گا اور آپ سے مشورہ بھی کرنا ہے۔" بلا تاریخ (خطوط داغ)

سُن لیا آپ نے حجاب کی ضد اور ترباہٹ کا حال پھر داغ کا اس سے دبنا بھی دیکھا، "کوئی عذر کر کے آپ کے یہاں آتا ہوں" صاف ظاہر ہے کہ داغ کتنے مجبور ہو گئے تھے، داغ نے ساری عمر رنگ رلیوں میں گزاری قلعۂ معلیٰ میں راجہ اندر بنے رہے پھر رامپور میں رہے تو نواب صاحب رامپور کے اندر کے اکھاڑے میں ہی رہے اس طرح جوانی اور ادھیڑ پن گزرا، حیدرآباد آئے تو ایک چھوڑ دو دو رنڈیاں مستقل نوکر رہیں ایک گویا ہمیشہ نوکر رہا باہر سے آنے والی رنڈیاں ہمیشہ آتیں ان کے مجرے ہوتے اس طرح داغ راگ رنگ میں محو رہتے تھے۔

حجاب کی دینداری نماز اور وظیفہ سب بھلا بھگت پن تھا، گویا بلی حج کو چلی تھی، یہاں آتے

ہی چند ہی روز کے بعد داغ سے خورشید عالم سے حسن علی خاں سے سب سے بے پردہ ہو گئی اور داغ اور ان کی بیٹی لاڈلی بیگم پر چھانے لگی، داغ تو خیر بڑے ہی ضابطہ آدمی تھے انہوں نے برداشت کیا مگر لاڈلی بیگم بھلا اس کو کیا برداشت کر سکتیں دونوں میں خاصی ٹھن گئی،

داغ کے متعلق ۲۰/اپریل سنہ ۱۹۰۲ء کے روزنامچے میں افتخار عالم نے لکھا ہے۔

"آج سہ پہر سے شام تک مرزا صاحب پتنگ بازی دیکھتے رہے، کبھی خود پتنگ اڑایا کرتے تھے مگر اب صرف اتنا رہ گیا ہے کہ صحن میں بیٹھے بیٹھے خورشید عالم کو پتنگ اڑاتے ہوئے دیکھ لیا کرتے ہیں، مرزا کو قریب قریب تمام بازیوں کا کم و بیش شوق رہا ہے، بٹیر بازی، کبوتر بازی گو خود نہیں کرتے لیکن دوسروں کے شغل میں شریک ضرور ہو جاتے ہیں، موسیقی سے انہیں فطری لگاؤ ہے اور اس مذاق کے اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر واجد علی شاہ ہیں، ستار نواز، بین نواز، گویے، ڈوم، ڈھاڑی اب سب کی پیشوا رنڈیاں ان کی صحبت کا لازمہ ہیں، طبلہ خود بھی بجاتے ہیں، ستار میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں دو تین راگ راگنیاں خود بھی ایجاد کی ہیں شاہ ظفر کا ایجاد کیا ہوا ایک راگ بہت بجاتے ہیں، حیدر آباد کے قیام میں ایک رنڈی ہمیشہ ان کے پاس ملازم رہی الغرض یہ کہ مرزا صاحب کے شب و روز عیش میں گذرتے ہیں منی بائی حجاب کے آنے کے بعد گو ان کا پروگرام بدل چکا ہے لیکن ان کی تشریف آوری سے پہلے کوئی سا دن تھا جو ان رنگ رلیوں میں نہیں گزرتا تھا، مغرب کا وقت گزرا اور گانا سننے کو دل چاہنے لگا ستار نواز کو بے اس کو بلایا کہ گانا بجا اسی وقت شہر کے طائفے بھی آ جاتے ہیں، دکنی طوائفوں کا انہوں نے گانا کبھی نہیں سنا لیکن دکنی طوائفیں بھی دو ایک آجایا کرتی تھیں، گھنٹوں ان سے مذاق رہا کرتا تھا، سورت کی ایک طوائف اختر جان کو کوئی دو برس تک سو روپیہ ماہوار پر نوکر بھی رکھا دکن میں وہ عورت بھی جانی تھی خوش اندام، خوش رو، خوش وضع، خوبصورت، میانہ قد، مختصر ایسی کہ ایک جگہ اسے قرار نہ تھا اس کی ادائیں مرزا

کے دل میں گھر کر گئی تھیں۔ ورنہ......... کے لائق مرزا کا سن نہیں تھا، اختر جان کچھ عرصہ کے بعد حیدرآباد سے سورت چلی گئی، مرزا صاحب اس کی فرقت میں شکستہ دل رہنے لگے لیکن حجاب کے آنے کے بعد یہ سب دنیا خاموش و معطل ہے۔"

روزنامچہ نگار نے جو حال اختر جان کے سورت جانے کا لکھا ہے یہ اس حد تک درست ہے کہ اختر داغ سے خفا ہو کر ضرور چلی گئی تھی مگر وہ حیدرآباد سے باہر گئی ہی نہیں تھی بلکہ ایک سیشن جج کے گھر بیٹھ گئی تھی بعد میں جب وہ سیشن جج کو چھوڑ کر ان کے گھر سے نکل آئی تو پھر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر نے اُسے داغ کے پاس بھجوا دیا اور وہ مدتوں داغ کے پاس رہی، داغ کے بعد بھی اختر حیدرآباد ہی میں رہی، اُسے میں نے بعض شادیوں میں دیکھا اور سُنا ہے گو وہ بوڑھی ہو گئی تھی مگر پھر بھی اس میں ایک بات تھی ۱۹۱۲ء کے بعد اختر نے حیدرآباد ہی میں انتقال کیا۔

۱۵ مئی ۱۹۰۲ء کا روزنامچہ بھی بہت ہی دلچسپ ہے:-

"آج شام کو مرزا صاحب کے یہاں منی بائی حجاب کے فوٹو کھینچنے کا اہتمام تھا، بڑی زبردستیوں سے حجاب فوٹو کھنچوانے پر آمادہ ہوئی تھیں مرزا صاحب بضد تھے کہ دونوں کا فوٹو ایک جگہ ہونا چاہئے حجاب کو اس پر اعتراض تھا فوٹو گرافر نے اس جھگڑے کو اس طرح ختم کیا کہ مرزا صاحب کو اشاروں اشاروں میں کچھ سمجھا دیا، مرزا صاحب حجاب کی کرسی سے پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئے فوکس سے دیا گیا منی بائی کو بھی یقین رہا کہ صرف میرا فوٹو لیا جا رہا ہے لیکن فوٹو گرافر نے بار آکر مرزا صاحب کو یقین دلایا کہ وہ عاشق و معشوق کا یکجائی فوٹو پیش کرے گا، فوٹو گرافر کے رخصت ہونے کے بعد مرزا صاحب نے فی البدیہہ یہ رباعی ارشاد کی:-

تم تو فلک حسن پہ ہو ماہِ منیر ۔۔۔ سایہ کی طرح ساتھ ہے داغ دلگیر
خال لب گلفام ہے شاہد اس کا ۔۔۔ بے داغ نہ کھینچ سکی تمہاری تصویر

یہ تصویر ناظر علی وزنٹو گرافر نے لی تھی، بچپن میں میں نے ناظر علی کے پاس دیکھی ہے، اس کے علاوہ ایک اور تصویر بھی میں نے محمد یوسف فوٹو گرافر کے پاس بھی دیکھی ہے جس کی کاپیاں امین احسن بسمل اور احمد حسن نصاری کے پاس بھی تھیں۔ روزنامچہ نگار نے اوپر کی رباعی کو فی البدیہہ لکھا ہے، یہ ان کی خوش فہمی ہے یہ اور اس کے ساتھ کئی ایک رباعیاں داغ نے اس وقت کہی تھیں۔
جب حجاب نے اپنی تصویر کلکتہ سے رامپور بھجوائی تھی آپ بھی انہیں سن لیجئے:

اس شکل کا دنیا میں نہیں کوئی نظیر
صورت ہے طبیعت سے سوا شوخ و شریر
اللہ رے حجاب بدگمانی تیری
بھیجی ہے مجھے نصف بدن کی تصویر

ہر عیب سے خالی ہے تمہاری تصویر
دنیا سے نرالی ہے تمہاری تصویر
جب ہاتھ لگاؤں تو جی ڈرتا ہے
کہہ بیٹھے نہ کچھ منہ سے تمہاری تصویر

دل سے سکے مکرتی ہے تمہاری تصویر
یہ بات تو کرتی ہے تمہاری تصویر
خاموش ہو جاتی ہے اس کے آگے
کیا داغ سے ڈرتی ہے تمہاری تصویر

چونکہ حجاب کے ہونٹ پر ایک تل یا مسہ تھا جو سفید رنگ پر بہت کھلتا تھا اس لئے تصویر میں اُسے دیکھ کر داغ نے کہا تھا؎ بے داغ نہ کھنچ سکی تمہاری تصویر!
اور شہادت میں خالِ لبِ گلفام کو پیش کیا تھا۔
اس تصویر کے واقعہ کے وقت چونکہ یہ پرانی رباعی حسبِ حال پاکر داغ نے سنائی تھی اس لئے روزنامچہ نگار کو اس پر فی البدیہہ کا گمان ہوا۔
حجاب نے حیدرآباد پہنچتے ہی داغ پر چھانا شروع کر دیا تھا سب سے پہلے رنڈیوں کی آمد و رفت کی ممانعت ہوئی پھر اختر جان کو نکلوا دیا، داغ کو دن بھر اپنے پاس زنانہ حصہ میں بٹھانا

شروع کر دیا۔ جب یہ سب باتیں ہو گئیں تو تقاضا شروع کیا کہ نکاح کر لیجئے۔

۳۰ مئی ۱۹۰۲ء کے روزنامچے میں لکھا ہے:

"آج شام کو مرزا صاحب فرمانے لگے کہ کچھ سنا، نکاح کا تقاضا ہو رہا ہے۔ عدت کے دن پورے ہو چکے ہیں، میں بھی تیار ہوں" اس کے بعد یہ شعر پڑھا ؎

برائے نام نکالے فلک مرے ارماں　　جو ہے نکلنے کی حسرت کہاں نکلتی ہے

پھر فرمایا "بڈھے ہو گئے منہ میں دانت نہیں پیٹ میں آنت نہیں نکاح کا تحصیل اور جذبۂ عشق دونوں کے پاس نہ دام؛

وقت آخر ہوا مگر اے داغ　　ہوس زندگی نہیں جاتی"

۱۷ جون ۱۹۰۲ء کا روزنامچہ ملاحظہ ہو،

"آج دو روز سے مرزا صاحب بہت شکستہ اور بجھے بجھے سے نظر آتے ہیں۔ وہ شگفتگی اور خندہ پیشانی مفقود ہے جو مرزا صاحب کی فطرت ثانیہ ہے، وجہ افسردگی اس کے سوا دوسری نہیں کہ بی حجاب سے کچھ ان بن ہو گئی ہے، دن کا زیادہ وقت گھر میں بسر کرنے کی بجائے باہر گزرتا ہے، آج دوپہر کا کھانا بھی باہر (مردانے میں) کھایا، شام کو بی حجاب نے (اندر) بلایا تو برجستہ یہ شعر فرمایا اور مجھ سے ایک کاغذ کے پرزے پر لکھوا کر بھجوا دیا ؎

در پردہ تم جلا دو جلا دوں نہ میں یہ خوش؟　　میرا بھی نام داغ ہے گر تم حجاب ہو!

مرزا صاحب کی اب عمر ایسی نہیں کہ وہ عاشقانہ غمزوں اور نخروں کے متحمل ہو سکیں یہ سب جوانی دیوانی کے کرشمے ہوتے ہیں، انسان بڑی کڑی کڑی جھیل جاتا ہے، بی حجاب تو دلی عمر رفتہ کی یادگار رہ گئی ہیں لیکن اس کا احساس نہیں اور ناز و غمزہ سے پہلو تہی نہیں فرمائیں۔ اپنی اور مرزا کی عمر کا لحاظ کر کے ان کا شتر غمزوں سے گریز کرنا چاہئے تھا لیکن برخلاف اس کے آئے دن شکر رنجی کا کوئی نہ کوئی پہلو اختیار کر لیتی ہیں جس کا اثر مرزا پر کئی کئی دن رہتا ہے۔"

افسوس ہے کہ روزنامچہ ۱۷ جون ۱۹۰۲ء کو ختم ہو گیا ہے معلوم نہیں اتنا ہی لکھا گیا یا رادم رفیق مارہروی کو اتنے ہی مسودے ملے بہر حال اس کے بعد کا روزنامچہ نہیں ہے،

پہلی دفعہ جو مقدمہ فریاد داغ پر میں نے لکھا ہے اُس وقت میرے پیش نظر رفیق مارہروی کا مضمون "مرزا داغ اور منی بائی" مطبوعہ مجلہ نگار لکھنو بابت ماہ اگست ۱۹۴۵ء تھا جس سے میں نے روزنامچے کے اقتباسات لئے تھے، اس کی طباعت کے بعد رفیق صاحب نے اس روزنامچے کو بزم داغ کے نام سے مرتب کرکے اس کی ایک نقل مجھے بھی عنایت کی جس سے پیش نظر اقتباسات لئے گئے ہیں اس کے لئے میں برادر عزیز کا ممنون ہوں ۔

حجاب کے مجبور کرنے پر داغ نے عقد نکاح پر آمادگی ظاہر کردی تھی اور ان کے احباب تماشا دیکھ رہے تھے مگر ان کی آغوشی بیٹی لاڈلی بیگم اور داماد سائل دہلوی اور اخیافی بھائی خورشید عالم نے پریشان ہوکر اُن کے دوستوں سے فریاد کی چنانچہ ان لوگوں نے داغ کو سمجھایا کہ حجاب نے آتے ہی آپ پر احتساب قائم کردیا ہے اور آپ ابھی سے بگڑنے لگے ہیں، عقد نکاح کے بعد تو وہ آپ کا ناک میں دم کردیگی اور آپکے بنائے کچھ نہ بنے گی ذرا اسکا بھی خیال رہے، لاکھ بوالہوس ہی مبتلا ہوں مگر داغ بھی ایک ہی جہاں دیدہ تھے وہ نزاکت حالات کو سمجھنے لگے اور انہوں نے بلطائف الحیل عقد کو ٹالنا شروع کردیا اس پر حجاب بگڑ گئی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑا ہونے لگا چنانچہ اس کے تصفیہ کے لئے حسن علیخاں آمیر بلائے گئے اس کی تفصیل داغ کے خط میں دیکھ لیجئے :۔

"نواب صاحب از راہ لطف آپ کو خبر بھی ہے؟ ہاں خبر ہو تو کیونکر، آپ تو معشوق کی طرح تغافل کی گود میں کھیل رہے ہیں، لیجئے میں بتلائے دیتا ہوں کہ حجاب آج دو روز سے روٹھی بیٹھی ہیں اپنے متعلقین کو بلانے کے لئے مصر ہیں، میں نے مذاق میں انکار کردیا اس سے ان کی دل شکنی ہوئی اور یہ سامان فساد اٹھ کھڑا ہوا، آپ ہی انہیں سمجھائیں تو سمجھیں آج چار روز سے آپ آئے ہی نہیں میں برابر منتظر رہا، یہ جو دیکھتے ہی آپ میری مدد فرماتے میں لاکھ سمجھاتا ہوں کہ یہ محض مذاق تھا تم اپنے متعلقین کو خوشی سے بلا سکتی ہو مگر میرے گھر میں تو اتنی گنجائش نہیں البتہ مکان کرایہ پر لے کر انہیں رکھا جا سکتا ہے اب آپ تشریف لائیں تو سب باتیں

ملے ہوں وہ آپ کے آنے پر شاید راضی ہوں گی۔" بلا تاریخ (خطوط داغ)

معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ہی حسن علی خاں نے مکان کا انتظام کیا اور حجاب دوسرے مکان میں اٹھ گئیں اور کلکتہ سے اُن کے متعلقین بھی آ گئے۔ حجاب یہ سمجھ کر حیدرآباد آئی تھی کہ داغ شاہ دکن کے استاد ہیں ایک ہزار روپیہ تنخواہ ملتی ہے روزانہ لاکھوں کی سرفرازیاں ہوتی ہیں میں پھانس کر داغ کو اپنے قبضے میں کر لوں تو ہزار نہ سہی پانچ سو ماہوار تو کہیں نہیں گئے، مگر اس نے جو طریقہ داغ پر حاوی ہونے کا اختیار کیا تھا وہ بالکل غلط تھا، اس لئے اس کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے حجاب جب دوسرے مکان میں اٹھ گئی تو داغ نے ابتداً ساٹھ روپے ماہوار دینا شروع کئے مگر جب وہ لوگوں سے قرض دام کرنے لگی تو سو روپیہ دینا قرار پایا۔ مگر یہ سو روپے بھی اس کے کنبے کے لئے کافی نہ تھے کیوں کہ حجاب کھلے ہوئے ہاتھ کی ڈیرہ دار طوائف تھی، ادھر داغ ماہوار تنخواہ بھجواتے ادھر خرچ ہو جاتی اور پھر وہ تقاضا کرنے لگتی۔ داغ بہت محتاط طبیعت آدمی تھے اور ان کی احتیاط بخالت کی حد تک پہنچتی تھی اس لئے حجاب پریشان رہنے لگی جس کا احساس داغ کو بھی ہونے لگا۔ چنانچہ حسن علی خاں کے نام خط میں اس کی تفصیل موجود ہے:

"نواب صاحب مکرم! بسمہ اللہ تعالیٰ! حجاب کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ حالانکہ ان کی یہی ضروریات جب اعزہ اُن کے پاس یہاں نہیں تھے تو اچھی طرح پوری ہو جاتی تھیں، آئے دن سرگرداں رہتی ہیں، وہ ہنسی دل لگی وہ مشغول سب غائب اکثر معمولی باتوں پر اختلاف اور جھگڑا کر بیٹھتی ہیں آپ سے بارہا گزارش کر چکا ہوں کہ آپ ہی انہیں سمجھائیں میری عمر کا تقاضا یہ نہیں کہ ان کی تلون مزاجی کا متحمل ہو سکوں پھر جہاں تک ہو سکتا ہے .... پہلو تہی کرتا ہوں، آپ ان کے اور میرے حالات پر پوری نظر رکھتے ہیں کچھ تو سوچئے غور کر کے مجھے بتائیے کل اختر جان کے باب میں دیر تک جھگڑا کرتی رہیں، گانا سننے کا نہ صرف مجھے شوق ہے بلکہ موسیقی کا دیوانہ ہوں، ان ناچ والیوں میں میری یہ خواہش کیسے پوری ہو، میں آپ کا منتظر ہوں سواری بھیجتا ہوں جلدی تشریف لائیے۔ الٰہی! تو نے حسینوں کو کیوں کیا پیدا؟ کچھ ان کی ذات سے دنیا کا انتظام نہیں!

(خطوط داغ)

غور فرمائیے داغ کس بھولے پن سے لکھتے ہیں "حجاب کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں" حالانکہ یہی ضروریات جب اعزہ ان کے پاس یہاں نہیں تھے تو اچھی طرح پوری ہو جاتی تھیں" غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جو مقررہ رقم داغ حجاب کو دیتے تھے وہ حجاب اور ان کے بھائی کی ضروریات کے لئے پوری ہو جاتی تھی اب کلکتہ سے دس پندرہ متعلقین آ گئے تھے پھر یہ رقم ان سب کے لئے کس طرح کافی ہو سکتی تھی؟ داغ باوجود فراست وصلاحیت کے اس گتھی کو سلجھانے سے قاصر تھے اور یہی بات بنائے فساد ہوئی۔

یہ چپقلش جاری ہی تھی کہ داغ حضور نظام کے ساتھ شکارگاہ زسم پیٹھ چلے گئے جنگل کی گرمی، شکار کی بے لطفی اور طبیعت کے انقباض نے بہت چڑچڑا بنا دیا وہاں سے جو احکام جاری ہونے لگے وہ نادری تھے چنانچہ زسم پیٹھ سے ۲ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۲ مئی ۱۹۰۳ء کو حسن علی خاں کو خط لکھا:

"...... ان (حجاب) کی گزریں تو سو روپے مہینے میں بھی نہ ہوگی جب وہ میرے مکان میں تھیں تو گیارہ مہینے تباقی تھیں مکان دار کو معرفت عبدالمجید کے بلا کر دریافت کرو کہ تمہارا کیا لینا ہے از روئے کاغذ بتا دے اور نصف کرایہ پر فیصلہ کرتے ہیں اگر لینا ہو تو اس سے زیادہ یہاں سے نہیں ملیں گے ورنہ یہ روپیہ بھی تمہارا ڈوب جائے گا، ان کے پاس روپیہ نہیں سرکار ان سے ناراض ہیں ان کی حرکتوں سے ترس کھا کر وہ یہ دیتے ہیں نصف کرایہ پر بھی فیصلہ جب ہو گا کہ اسی وقت ان کو مکان سے اٹھا دو" (انشائے داغ ص ۱۴۱)

اس کے تیسرے ہی روز ایک خط اور لکھا ہے:

"نواب صاحب قنافل شعار اسلمہ اللہ تعالیٰ، تین دن سے خط کا منتظر ہوں جواب ندارد لفظ بی جو شرفا کے واسطے ہے اس پر خفا ہیں میں نے خوب جھاڑا ہے کچھ روپیہ لڑکی سے لیا پچاس یہاں سے گئے ...... آپ سے مانگتی ہیں ذرا ان کو جھاڑیئے گا میں نے جو ان کو خط لکھا ہے۔ وہ اماں کے خط میں ہے اس کو اتا سے لے کر آپ پہنچا دیں تو بڑی عنایت، ایک غزل ملفوف اور

بھیجتا ہوں یہ نہ معلوم ہو سکا کہ پہلی سب غزلیں میسفہ میں صاف پڑھ گئیں کہ ابھی کوئی باقی ہے یہاں خیریت ہے گرمی شدت کی ہے بچوں کو دعا کہئے۔"

(۵ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ م ۲ جون ۱۹۰۳ء)

اوپر کے خط میں اناک کے خط میں جس خط کے ملفوف کرنے کا ذکر ہے وہ غالباً یہی خط ہے۔ دیکھئے کتنا کاروباری خط ہے، دلدار و دلنواز مہربان دشمن جاں سے اترتے اترتے معاملہ جناب من تک پہنچ جاتا ہے۔

"جناب من! میرا جو منشا ہے وہ نواب صاحب کی زبانی کہلوا چکا ہوں اس سے زیادہ کی مجھ سے امید نہ رکھو مکان کا کرایہ میرے ذمے، تمہارے جلوس اور دوسرے متعلقات میرے ذمے تو پھر سو روپیہ تمہارے لئے کیوں کافی نہیں ہیں ادھر ادھر سے قرض لینا اچھا نہیں خود ذلیل اور میں ملعون ہوتا ہوں، ان لوگوں سے جو تمہارے سر ہیں کہو کہ وہ خود اپنے کفیل ہوں دوسرے پر بار ہونا کسی طرح مناسب نہیں۔"

خدا بخش تاریخ ورود سے بے تعلق ہے اس کو میرے متعلق سمجھو اس کی آمد و رفت تمہارے یہاں میرے منشا پر ہے ورنہ وہ خود تم سے شاکی ہے اور خدا بخش تمہارا روادار نہیں، یہ چلن محاسبہ قبول ہیں کرو، کیا گنجائش دلوں میں پیدا کر سکتے ہیں نواب صاحب آئیں تو بھیجوں، تمہاری باتیں میری سمجھ میں تو نہیں آتیں۔ یکایک جو تغیر ہو گیا ہے اس کی وجہ خدا کے سوا کسے معلوم ہو سکتی ہے نواب صاحب سے کل امور پر صاف صاف اپنا ارادہ ظاہر کرو اگر کلکتہ کی واپسی چاہتے ہو تو کھل کر بتاؤ، مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے، ہر چیز تمہاری مرضی پر منحصر ہے اور اب بھی ہو گی ناراض ہو کر جانا منظور ہے تو کون روک سکتا ہے۔ بلا تاریخ، (خطوط داغ)

خدا بخش حجاب کے چھوٹے بھائی تھے جنہیں داغ بہت پسند کرتے تھے اور جب حجاب الگ گھر لے کر جا رہی تو داغ نے خدا بخش کو اپنے پاس ہی رکھا تھا مگر وہ حجاب کے پاس روزانہ آتے جاتے تھے دوسرے معنی میں داغ کی طرف سے حجاب کی نگرانی کرتے تھے

جب حجاب کلکتہ واپس ہو گئی تو یہ حیدر آباد ہی میں رہ گئے آخر عمر میں انہیں میں نے بھی دیکھا ہے، منڈلیوں کو تعلیم دیا کرتے تھے فن داں اور بڑی ہی غریب طبیعت کے آدمی تھے حیدر آباد ہی میں مرے۔

داغ کا عملی آدمی ہونا اس سے ثابت ہے کہ وہ یہ پسند نہ کرتے تھے کہ لوگ دوسروں کی کمائی پر گزارہ کریں چنانچہ انہوں نے "ان لوگوں کو جو تمہارے سر ہیں کہو کہ وہ خود اپنے کفیل ہوں" لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ کتنے کمیونسٹ قسم کے تھے۔ داغ نے کلکتہ کی واپسی کا اشارہ کر کے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ اب وہ حجاب سے بیزار ہو چکے ہیں اور کلکتہ چلی جائے تو انہیں افسوس نہ ہو گا۔

ایک خط برادرم میر حسین علی خاں کے پاس حجاب کا ہے جو آخری زمانے کا ہے:۔

"مہربانا! سلامت رہیے، تین خط روانہ کر چکی ہوں جواب نہیں ملا روپیہ بھی منگوایا تھا وہ بھی نہیں ملا، آخر میرا خرچ کس طرح اٹھے خدا جانے اسے کتنے ملے؟ مجھے تو آتا نے صرف سو دیئے اور تاکید بھی کی کہ زیادہ کی امید نہ رکھوں، میں آپ کے گھر والوں سے سخت ناراض ہوں مجھ سے دشمنی کر کے بانٹ لیں گے...... خدا میرے دشمنوں کو غارت کرے"۔

(یکم ربیع الاول ۱۳۲۱ھ م ۱۸ رجون ۱۹۰۳ء)

یہ کشمکش جاری ہی تھی کہ ۴ اگست ۱۹۰۳ء کو حجاب جس گھر میں رہتی تھی وہ گر گیا اور وہ داغ کے گھر پہنچ گئی، چنانچہ اس کی اطلاع داغ نے حسن علی خاں کو اس طرح دی ہے:

"..... بی حجاب کل سے وارد ہیں اور آپ کی مشتاق ان کا مکان گرا جان بچ گئی اس کی مرمت ہو رہی ہے یہاں تو کہیں ٹھکانا نہیں" (۷ر جمادی الاول ۱۳۲۱ھ)

اس کے بعد نہ تو داغ اور حجاب کے خطوط ہی مل سکے اور نہ کوئی ایسی اطلاع ہمدست ہوئی جس سے حجاب کے قیام حیدر آباد کا پتہ چلتا، صاف ظاہر ہے کہ اگست یا ستمبر ۱۹۰۳ء میں حجاب کلکتہ واپس ہو گئی اور داغ کا معاشقہ اس حزنیہ پر ختم ہو گیا۔

مثنوی فریادِ داغ شعری اعتبار سے جتنی نفیس اور دلپذیر ہے معاشقہ کے لحاظ سے اتنی ہی دل گداز اور روح فرسا ہے۔ داغ نے الفاظی معاشقے کئے تھے تخیلی عاشق کی تھی مگر حقیقت میں حجاب سے پہلے انہوں نے کسی سے محبت نہیں کی تھی پہلے پہل حجاب سے جو دل لگایا تو ہجر و رقابت سے سابقہ پڑا صدمۂ ہجر کو داغ نے برداشت کر لیا مگر صدمۂ رقیب اٹھا سکے اور اس رشک و رقابت نے انہیں بہت جلایا یہی وجہ تھی جو وہ رامپور میں رہتے تک حجاب کو رامپور بلانے میں کامیاب نہ ہو سکے اور حجاب بھی رامپور جانے کی ہمت نہ کر سکی، رامپور کی بربادی کے بعد پریشانی و سراسیمگی نے یہ سودا ہی سر سے نکال دیا اور داغ میدانِ عمل میں اتر آئے، جب وہ مطمئن ہو گئے اور حیدرآباد میں مستقل سکونت اختیار کر لی تو پھر گدگدی پیدا ہوئی اور حجاب سے سلسلۂ خط و کتابت شروع کیا۔

رامپور سے جانے کے بعد ہی حجاب ایک شخص کی پابند ہو گئی تھی، جب رامپور کا تختہ الٹا اور داغ سراسیمہ ہو گئے تو حجاب نے کسی شخص سے عقد کر لیا، پھر داغ نے بلانا شروع کیا تو اس نے طلاق لے کر حیدرآباد کا رُخ کیا اور ایامِ عدت حیدرآباد ہی میں گزار کر داغ سے نکاح کرنے کی کوشش کرنے لگی، والدہ مرحوم داغ کے خاص شاگردوں میں سے تھے قیام حیدرآباد کے زمانے میں حجاب کو بھی انہوں نے بارہا دیکھا تھا وہ فرمایا کرتے تھے کہ حجاب بڑی ہی چنچل اور طرار عورت تھی یہی وجہ تھی جو داغ سے نباہ نہ کی۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح داغ نے بیان کیا ہے انہیں ایک رفیق کی ضرورت تھی اس لئے انہوں نے حجاب کو بلوایا تھا مگر وہ بجائے رفاقت کے حکمرانی کرنے لگی اور چاہتی تھی کہ داغ اس کے اشاروں پر ناچیں، مگر حجاب کی روانگی سے وہ بغیر متاثر ہوئے نہ رہ سکے اور متاثر بھی اتنے ہوئے کہ ان کی صحت ہی برباد ہو گئی اور دل بجھ گیا تھا، گانا سننا تقریباً چھوڑ دیا، عطر کا شوق بھی کم ہو گیا تھا اور کھانا بھی چھوٹ رہا تھا، دوستوں اور شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ اب مجھے کسی بات کا لطف نہیں آتا، اسی بے لطفی میں داغ نے سال بھر گزارا اور [illegible] ۱۹۰۵ء

سے صاحب فراش ہی ہوگئے اور یہ سلسلہ اتنا طویل ہوا کہ پانچ چھ مہینے بیمار رہ کر ۱۵ فروری ۱۹۰۵ء کو اللہ کو پیارے ہوگئے اور ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ کو عید کی نماز کے بعد نماز جنازہ حیدرآباد کی شاہی مسجد (مکہ مسجد) میں پڑھائی گئی اور درگاہ یوسفین میں سپرد خاک ہوئے ؎

داغؔ تجھ کو باغِ جنت ہو نصیب!

اس مضمون کی ترتیب میں مجھے صدیق مکرم مولانا امتیاز علی عرشی رامپوری کے بھیجے ہوئے مسودات خطوطِ داغؔ اور محبی رفیق مارہروی کے مسودہ مجموعۂ خطوطِ داغؔ اور انہیں کے مرتبہ روزنامچۂ داغؔ سے بڑی مدد ملی ہے اس لئے ان دونوں کا شکر گزار ہوں، میں خوش ہوں کہ فریادِ داغؔ کا یہ دوسرا اڈیشن شائع ہو رہا ہے، انشاءاللہ تعالیٰ قریب میں داغؔ کی مستقل سوانح عمری "مرزا داغ" پیش ہوگی فقط۔

تمکین کاظمی

۱۵ ستمبر ۱۹۵۶ء
اردو اکیڈمی
سلطان شاہی حیدرآباد دکن ۲ (ہند)

مثنوی

فریادِ داغ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد ہے عشق آفریں کے لئے — نعت ہے ختم مرسلیں کے لیے
السلام اے چہار یارِ کبار — السلام اے ائمۂ اطہار
مدح نواب نامدار کروں — جان قربان دل نثار کروں
حاجی و زائر و خدا آگاہ — شاہ درویش خوئے ظل اللہ
وہ رئیسِ ولا در اخترِ ہند — وہ مخاطب مشیر قیصرِ ہند
قیصرِ ہند سے مشیر خطاب — اور فرزند دلپذیر خطاب
اس سخی کا ہے کام دینے کا — اس سے کیا دینے سے نام دینے کا
کیا خزانہ بھرا پڑا پایا — دل خزانے سے بھی بڑا پایا
سو ہنر ایک بات میں دیکھے — سو ہنر ایک ذات میں دیکھے
مسند آرائے رام پور رہیں — تا قیامت مرے حضور رہیں
ہے عجب شہر مصطفےٰ آباد — اس کو رکھنا مرے خدا آباد
سب اسے رام پور کہتے ہیں — ہم تو آرام پور کہتے رہیں
خیر نواب کی مناتے ہیں — جس کا کھاتے ہیں اسکا گاتے ہیں

عشق کی تعریف

خوبیاں عشق کی بیان کروں — کچھ طبیعت کا امتحان کروں

سب سنے کی ہیں برائیاں اس کی
میں نے لکھیں بھلائیاں اس کی

دل بنا ہے اسی مزے کے لئے
میں نے یہ لطف جان دے کے لئے

عشق تاب و توانِ عاشق ہے
شانِ عاشق نشانِ عاشق ہے

عشق ہی آرزوئے عاشق ہے
آرزو آبروئے عاشق ہے

عشق نعمت ہے آدمی کے لئے
عشق جنت ہے آدمی کے لئے

دل اسی سے جوان رہتا ہے
مرمٹوں کا نشان رہتا ہے

عشق کا داغ غیرتِ گُل ہے
دودِ فریاد رشکِ سنبل ہے

عشق کیا کیا بہار دیتا ہے
یہ دلوں کو ابھار دیتا ہے

بزدلوں کو دلیر کرتا ہے
یہ دلیروں کو شیر کرتا ہے

عشق سے کس کا زور چلتا ہے
اس سے ستم کا دم نکلتا ہے

خاک سے عشق پاک کرتا ہے
زندہ وہ ہے جو اس پہ مرتا ہے

شیوۂ خاص ہے یہ عام نہیں
جو نکمّے ہیں ان کا کام نہیں

اس سے گمنام نام پاتے ہیں
اس سے ناکام کام پاتے ہیں

یوں ہو مشہور قیس سا قلاّش
یوں ہو مشہور ایک سنگ تراش

عشق کے نام پر نثار ہوں میں
اس کے انجام پر نثار ہوں میں

عشق کا درد راحتِ جاں ہے
عشق کا زہر آبِ حیواں ہے

یہ ہے ٹکسال نقدِ جاں کے لئے
یہ کسوٹی ہے امتحاں کے لئے

اس سے دل کا چراغ روشن ہے
آنکھ روشن دماغ روشن ہے

عشق سے رہتی ہے طبیعت گرم
شعلہ رویوں کے ساتھ صحبت گرم

عشق کے کھیل ہم نے کھیلے ہیں — سو پرپزاد ہم اکیلے ہیں،
عشق کے لطف ہم نے پائے ہیں — کیا کہیں کیا مزے اڑائے ہیں
عشق سے دل گداز ہوتا ہے — ناز میں بھی نیاز ہوتا ہے
سو دوائیں ہیں اک کسک اس کی — سو ادائیں ہیں اک لٹک اس کی
یہ ہے معشوق نوجوانوں کا — یہ ہے محبوب رازدانوں کا
عشق سے آدمیت آتی ہے — آدمی کو مروت آتی ہے
عشق سب بل نکال دیتا ہے — عشق سانچے میں ڈھال دیتا ہے
ہے معلم ہزار مجنوں کا — سبق آموز ہے فلاطوں کا
عشق کا لطف زندگانی ہے — زندگی کا مزا جوانی ہے
عشق عاشق کو بخشواتا ہے — عشق جنت میں لے کے جاتا ہے
عشق ایمان ہے خدا رکھے — یہ مری جان ہے خدا رکھے
عشق باطن ہو عشق ظاہر ہو — اس سے توبہ کرے تو کافر ہو
نالۂ عشق نغمۂ نے ہے — اثرِ عشق نشۂ مے ہے
اس سے دل کو سرور ہوتا ہے — اس سے نشے میں چور رہتا ہے

ساقی نامہ

ساقیا میں اگر دعا مانگوں! — تو بجز مے کے اور کیا مانگوں؟
یہ دعا اور کامیاب نہ ہو؟ — یہ دعا اور مستجاب نہ ہو؟
یہ دعائیں قبول ہو جائیں! — یا رسائی کے پھول ہو جائیں!

منہ سے نالے اگر نکالوں میں ! — خم گردوں کو چھید ڈالوں میں

درد سے سطح خاک یکسر ہو ! — کرۂ نار آتش تر ہو !

موجزن ہو وہ بادۂ گلگوں — بط مے کی طرح پھرے گردوں

خم گردوں سے آئے چھن کے شراب — ساقیٔ مے ہو چادر مہتاب

خم مے آسمان ہو جائے — میکدہ ہر مکان ہو جائے

نمک شور قند کا ہو جواب — سرکہ پہ ہو یقین بادۂ ناب

کاسۂ مے حباب ہو جائے — آب قلزم شراب ہو جائے

در الوز بیان ساغر ہو ! — ہالۂ مہ دہان ساغر ہو !

ساغر بادہ اختر تاباں ! — بیل انگور کی ہو کاہکشاں

گل میں ہو رنگ ساغر مل کا — شور قلقل ہو نالۂ بلبل کا

گریۂ شمع بھی ہو مستانہ — گرے مستوں کی طرح پروانہ

محتسب شوق سے ہو مے آشام — لب قاضی پہ والسّر ہو مدام

رات دن شغل مے پرستی ہو — ساری دنیا ہو اور مستی ہو

مردم دیدہ تک شرابی ہو — آنکھ پیدا ہو تو گلابی ہو

خوف کیسا کہاں کی بے ادبی — انتہا کی ہے مجھ کو تشنہ لبی

کس کو اندیشۂ گنہگاری — اور ہی شے ہے رحمت باری

مے گلفام کے مزے لوٹیں — ساغر و جام کے مزے لوٹیں

اس پری کی ہے حور کی صورت — ہے یہی ناز نور کی صورت

وہ ہیں مست شراب کی باتیں — کھول دے سو حجاب کی باتیں

عشق کی ابتداء

دوستو! حالِ غم کہوں نہ کہوں — ماجرائے ستم کہوں نہ کہوں،

مختصر واردات کہتا ہوں — سو کی ہیں ایک بات کہتا ہوں

مدتوں میں نے خونِ دل کھایا — دل لگانے کا خوب پھل پایا

ان بتوں کو نہ مانتا تھا میں — ان کو پتھر کا جانتا تھا میں

دل ستایا ہوا ہزاروں کا — داغ کھایا ہوا ہزاروں کا

خوب تکلیفِ عشق پائے ہوئے — بے وفاؤں سے رنج اٹھائے ہوئے

نہ بٹھاؤں پری کو صحبت میں — حور ہو تو نہ جاؤں جنّت میں

عشق کے دام سے رہائی تھی — پارسائی سی پارسائی تھی

چپکے چپکے نہ شب کو روتے تھے — چین سے اپنی نیند سوتے تھے

طبع بشاش تھی ملال نہ تھا — کسی محبوب کا خیال نہ تھا

اب کسی سے نہ دل لگائیں گے ہم — عہد پر عہد تھا قسم پہ قسم

دل لگی سے رہا بدل انکار — لاکھ توبہ ہزار استغفار

اِن بتوں سے مجھے بچائے خدا — حاصلِ دیں نہ حاصلِ دنیا

اِن بتوں کو مری بلا چاہے — میں نہ چاہوں اگر خدا چاہے

توبہ کر لی پیام سے میں نے — ہاتھ اٹھایا سلام سے میں نے

اس پیام و سلام سے نفرت — تھی محبّت کے نام سے نفرت

گو طبیعت تو گدگداتی تھی — پہ کسی سے نہ میل کھاتی تھی

آگ لگ جائے اِس محبت کو — چھیڑ کی دیر تھی طبیعت کو

عشق مدت سے تھا جو ناپیدا — اس نے پھر ولولہ کیا پیدا

بجھ گیا تھا چراغِ رسوائی — پھر ہوا تازہ داغِ رسوائی

موت کی شکل پھر نظر آئی — چوٹ مدت کی پھر اُبھر آئی

پھر ہوئیں دل میں حسرتیں آباد — نالے دینے لگے مبارکباد

پھر ہوا شوق جبہ سائی کا — پھر جما رنگ آشنائی کا

صبر یارو دل کا یا تھا نہ رہا — جبر پہ اختیار تھا نہ رہا

آتشِ غم سے داغ بھنتا تھا — کون اس دل جلے کی سنتا تھا

نہیں چھٹتی ہے لاگ الفت کی — نہیں بجھتی ہے آگ الفت کی

دل کو یہ لاگ چاک کرتی ہے — دل کو یہ آگ خاک کرتی ہے

آہ سے بھی شرر برستے ہیں — نفسِ سرد کو ترستے ہیں

کیا ٹھکانا ہے آتشِ غم کا — سینہ اک طبقہ ہے جہنم کا

سوزِ پنہاں سے جان جلتی ہے — اُف کئے سے زبان جلتی ہے

خانۂ دل میں داغ روشن ہے — رات دن یہ چراغ روشن ہے

ہے قیامت کا سوزِ داغِ جگر — نارِ دوزخ ہے جس کی خاکستر

لب پہ ہر دم جلے بھنے نالے — پڑ گئے ہیں زبان پر چھالے

جل گیا جب کسی سے بولے ہم — پھوڑتے ہیں جلے پھپھولے ہم

حسرت آتی ہے اپنی حالت پہ — پڑیں پتھر بتوں کی چاہت پر

اب وہ دکھ درد رونہ بھرتا ہوں — اُس زمانے کو یاد کرتا ہوں

پہلا آمنا سامنا

آ گیا بے نظیر کا میلا ، — دل پابندِ وضع کھل کھیلا
آفتِ جانِ ناتواں دیکھی — یک بیک مرگِ ناگہاں دیکھی
جلوہ دیکھا جو حورِ طلعت کا — سامنا ہو گیا قیامت کا
دیکھ کر اس پری شمائل کو — رہ گیا تھام تھام کر دل کو
دل کو میں ڈھونڈھتا رہا نہ ملا — آنکھ ملتے ہی پھر پتا نہ ملا ،
رنگ چہرے سے اُڑ گیا کوسوں — دل سے میں مجھ سے دل جدا کوسوں
آبرو کا لحاظ و پاس گئے — ہوش میں آؤں یہ حواس کیسے
یار و غمخوار مونس و ہمدم — کہہ رہے تھے تجھے خدا کی قسم
داغؔ! تو ماجرا بیان تو کر — تجھ کو کیا ہو گیا بیان تو کر!
کیوں ہے ایسا اُداس خیر تو ہے؟ — کیوں اُڑے ہیں حواس خیر تو ہے؟
سوچ اپنا بُرا بھلا دیکھو! — دیکھو، نواب میرزا! دیکھو!!
شمع ساں جسم زار گھلتا تھا — پر کسی پہ نہ بھید کھلتا تھا
جستجو میں بڑے بڑے عیّار — نہ ہوا کوئی واقفِ اسرار
ہم نشیں و ندیم مضطر تھے — سب طبیب و حکیم مضطر تھے
رنج سا رنج تھا حسینوں کو — داغؔ سا داغ مہ جبینوں کو
منہ پہ ہر اک کے اشک بہتے تھے — ہاتھ ملتے تھے اور کہتے تھے
اس طرح کا فہیم و فرزانہ — اے تری شان! یوں ہو دیوانہ!

اس کا قابو سے دل نکل جائے — ہے غضب اس پہ چال چل جائے
یہ ہر اک فن سے خوب واقف تھا — دوست دشمن سے خوب واقف تھا
ہم سمجھتے تھے ہوشیار اسے — عشق ہیں آزمودہ کار اسے
سینکڑوں رنگ اس نے برتے تھے — نام سے اس کے عشق ڈرتے تھے
یہ وفادار یہ خجستہ شعار — صادق القول صادق الاقرار
کس نے بیہوش کر دیا اس کو — کس نے خاموش کر دیا اس کو
کہیں آئی ہوئی طبیعت ہے — چوٹ کھائی ہوئی طبیعت ہے
اک نظر دیکھ بھال کر کوئی — لے گیا دل نکال کر کوئی
حال کیسا بدل گیا اس کا — کیا کلیجہ نکل گیا اس کا
صلح کل ہے یہ آدمیت میں — خیر ہے شر نہیں طبیعت میں
خوش بیاں خوش زباں کہاں ویسا؟ — فخرِ ہندوستاں کہاں ایسا؟
کس دغاباز نے اُسے مارا؟ — کس فسوں ساز نے اُسے مارا؟
کس قیامت نے پائمال کیا؟ — سحرِ بنگالہ نے حلال کیا؟
وہ پری چہرہ کیا قیامت ہے — داغ سے شخص کی یہ حالت ہے
اس بلا سے نکالنا اس کو — یا الٰہی! سنبھالنا اس کو!

معشوقہ کی تعریف

مجھ کو اس حال پر نظر ہی نہ تھی — دین و دنیا کی کچھ خبر ہی نہ تھی!
عشق نے تازہ روپ بدلا تھا — میں بھی میلے میں اک تماشا تھا

میلے والوں میں دھوم تھی میری　　خوش جمالوں میں دھوم تھی میری
ہوش آیا تو میں نے کیا دیکھا؟　　اک پری چہرہ خوش ادا دیکھا!
رُخ سے ظاہر تھا نُور کا عالم　　اور اس پہ غرور کا عالم
جُٹی جُٹی بھوؤں کی وہ تحریر　　کیوں نہ دل اس لکیر پہ ہو فقیر
چشم خوں ریز وہ فساد انگیز　　جس کا شاگرد فتنۂ چنگیز
گردن اس کی ہے وہ صراحی دار　　ہو صراحی بھی دیکھ کر سرشار
ایسے پتھر وہ دونوں قبۂ نور　　شیشۂ دل ہو جن سے چکنا چور
گات بانکی بدن سڈول تمام　　فتنہ قد فتنہ چشم فتنہ خرام
نگہ مست ہوشیاری سے　　لڑنے والی چھری کٹاری سے
لب پاں خوردہ پہ مسی کی دھڑی　　دل بیمار پر تھی رات کڑی
جوش پر باغ جوانی ہے　　یہی چاہِ ذقن کا پانی ہے
سج دھج آفت غضب تراش خراش　　کسی اچھے کی دل ہی دل میں تلاش
وہ اٹکتی ہوئی نظر آہا　　وہ لچکتی ہوئی کمر آہا
شوخیاں ہیں حجاب میں کیسی　　لن ترانی جواب میں کیسی
اُف رے عہدِ شباب کی مستی　　بے پئے ہے شراب کی مستی
ہائے تیرا کلام مستانہ　　ہائے تیرا خرام مستانہ
گرتے گرتے کبھی سنبھل جانا　　اِدھر آنا اُدھر نکل جانا
کبھی منہ پر نقاب کاکل ہے　　کبھی منہ پھیر کر تغافل ہے
کبھی سامنے سے اپنے ڈر جانا　　کبھی کچھ بانکپن بھی کر جانا

آئینے سے نگاہیں لڑتی ہیں — خود بخود چتونیں بگڑتی ہیں
کبھی کچھ تیوری میں بل دینا — کبھی آنکھیں دکھا کے چل دینا
آئینے سے نظر چرا جانا — آپ اپنے سے شرم کھا جانا
اپنے سایے سے پوچھنا تو کون؟ — ہے مرے ساتھ دوسرا تو کون؟
بھولے پن میں ہزار گھاتیں ہیں — اک خموشی میں لاکھ باتیں ہیں
ہے نرالی ادا زمانے سے — روٹھنا اور بھی منانے سے
اک قیامت کی چال چل جانا — دل چھلاوے کی طرح چھل جانا
ہر کسی کو نظر میں رکھ لینا — خوب کھوٹا کھرا پرکھ لینا
دل کو نظروں میں تول لیتے ہیں — مشتری کو وہ مول لیتے ہیں
حسن کی آن بان ہائے غضب — بے نیازی کی شان ہائے غضب
ناز جلوے دکھائے جاتا ہے — حسن چہرے پہ چھائے جاتا ہے
رقص طاؤس باغ سے اچھا — شعر کا لطف داغ سے اچھا
جس طرف اُٹھ گئی وہ شوخ نگاہ — شور اٹھا کہ بس خدا کی پناہ
اِدھر اظہار درد رنج و فراق — اور اِدھر گفتگو تراق پراق
کہہ دیا دل کا حال باتوں میں — نہ رہا کچھ خیال باتوں میں
نرم باتیں کبھی نزاکت سے — گرم فقرے کبھی شرارت سے
مفت دل لے کے نقد جاں لینا — باتوں باتوں امتحاں لینا
دل صفائی سے آشنا ہی نہیں، — بدگمانی کی انتہا ہی نہیں
جانب در جو بھول کر دیکھا — اُس کو تھا وہم کیوں اُدھر دیکھا

کیا ہو ایسے سے وصل کی تدبیر | جو نہ دے میرے خواب کی تعبیر
سادگی میں بناوٹیں کیا کیا | اکھڑی اکھڑی لگاوٹیں کیا کیا
شعبدے لاکھ لاکھ آفت کے | فقرے چلتے ہوئے قیامت کے
کچھ اشاروں سے مدعا کہنا | منہ ہی منہ میں بُرا بھلا کہنا
بھولی بھولی وہ پیار کی باتیں | شوخیاں اختیار کی باتیں
کبھی چبھتی ہوئی سنا دینا | سن کے تعریف مسکرا دینا
سخنِ ناصواب کہہ دینا | مجھ کو خانہ خراب کہہ دینا
کبھی دھمکی یہ دی کہ بجھیں گے | کبھی گردن ہلی کہ سمجھیں گے
مفت الزام میرے سر دھرنا | بے خطا بے قصور سے مرنا
وعدہ کرتے ہی مسکرا دینا | چٹکیوں میں مجھے اڑا دینا
سینکڑوں بات بات میں گھاتیں | میٹھی چھریاں وہ رس بھری باتیں
پتلے ہونٹوں میں کچھ تبسم بھی | مجھ کو کہنا کہ ٹھہرو ہو تم بھی
ہائے وہ قدر دانیاں اس کی | ہائے وہ مہربانیاں اس کی
ایک اک دم میں سو مداراتیں | لطف کے دن وہ عیش کی راتیں
ہر کسی سے اِک التفات کی بات | لطف کا لطف اور بات کی بات
سو اگرچہ کسی سے کام نہیں | پر کوئی شاکیٔ کلام نہیں
وضع کے ہر خلاف کیا مقدور | ایک سے لاکھ تک نہیں منظور
لوگ جو انجمن میں آتے تھے | پھلے پھولے چمن میں آتے تھے
سُن کے اس خوش کلام کی تقریر | سب کو حیرت تھی صورتِ تصویر

دیکھ کر اس کے روئے انور کو — آئے بیٹھے، اٹھے، گئے گھر کو

کبھی شعر و سخن کا چرچا تھا — کبھی اپنے وطن کا چرچا تھا

رات کٹتی ہنسی خوشی کیا کیا — ہوتی رہتی کھلی دلی کیا کیا

جاں نوازی پر اس کو ناز بھی تھا — بے نیازی میں کچھ نیاز بھی تھا

خانۂ دوست عیش خانہ تھا — ہائے کیا دن تھے کیا زمانہ تھا

ستم و جور کا گلا کیجیے — لطف قاتل بنے تو کیا کیجیے

شکوہ ہوتا ہے خود پسندوں سے — کیا شکایت نیاز مندوں سے

کون کہتا ہے ناز نے مارا — مجھ کو اس کے نیاز نے مارا

دیکھ کر یہ ادائیں آنکھوں سے — کیوں نہ لوں ہیں بلائیں آنکھوں سے

آسماں صدقے ہونے والوں میں — فتنۂ حشر پائمالوں میں

یہی انداز قہر کرتے ہیں — آدمی کیا، فرشتے مرتے ہیں!

ایسے پھندے سے دل ہو گیا آزاد — یاد آیا ہے مطلع استاد

خوب روکا شکایتوں سے مجھے — اس نے مارا عنایتوں سے مجھے

وہ بھلے جو جفائیں کرتے ہیں — وہ برے جو وفائیں کرتے ہیں

دل پھنسا ہے وفا کے پھندے میں — آ گیا کس بلا کے پھندے میں

عیش یہ آسماں نہ دیکھ سکا — چار دن شادماں نہ دیکھ سکا

گردشِ روزگار اور ہوئی
شکل لیل و نہار اور ہوئی

معشوقہ کی روانگی

آ گئی ہجر کی گھڑی سر پر — یہ بلا جھیلنی پڑی سر پر
اس کے لب پر پیام رخصت کا — میرے دل میں مقام حسرت کا
قصد ٹھہرا وطن کے جانے کا — رنگ بدلا نیا زمانے کا
حسرت آلودہ وہ نگاہیں تھیں — شرر آمیز میری آہیں تھیں
بات دل کی نہ لب تک آئی تھی — فکر میں آئی عقل جاتی تھی
مثلِ کاکل مجھے پریشانی — شکلِ تصویر اس کو حیرانی
سن کے رخصت کا نام روتے تھے — سب یہاں خاص و عام روتے تھے
ٹھہرے عہد وفا جو آپس میں — کھائیں باہم ہزار ہا قسمیں
رسمِ الفت کے ہو گئے اقرار — خط کتابت کے ہو گئے اقرار
شکر مہر و وفا کیا میں نے — بخشوایا کہا سنا میں نے
گویا بندہ وفا کا بندہ ہے — آدمی پھر خطا کا بندہ ہے
اس نے مجھ سے کہا یقیں مانو! — اک سرِ مو نہ فرق تم جانو!
جی نہیں چاہتا ہے جانے کو — پر چلے ہیں قلق اٹھانے کو
ہم کو کچھ آرزوئے مال نہیں — اس کا واللہ کچھ خیال نہیں
زر سے معمور ہے ہمارا شہر! — کونسا دوسرا ہے ایسا شہر؟
ہے حکومت کی شان کلکتہ، — سلطنت کا نشان کلکتہ،
انتخابِ زمان کلکتہ — فخرِ ہندوستان کلکتہ،

ہم تو بھوکے ہیں آدمیت کے — آدمیت کے ساتھ الفت کے

ایسے دیسوں سے جی نہیں ملتا — داغ سا آدمی نہیں ملتا

میری تسکین اسے کئے ہی بنی — یہ تسلّی مجھے دیئے ہی بنی

آتے جاتے ہیں سب خدائی میں — مر نہ جانا مری جدائی میں

جان سی چیز یوں نہیں کھوتے! — اس قدر پھوٹ کر نہیں روتے

جب کہ رنج و ملال ہوتا ہے — سچ ہے ایسا ہی حال ہوتا ہے

زندگی شرط ہے تو آئیں گے — لطف صحبت کے پھر اٹھائیں گے

دل سے نزدیک ہم ہیں دور نہیں — اس قدر دور رامپور نہیں

یاد رکھنا ہمیں یہ یاد رہے — اسی صورت سے اتحاد رہے

مصرع میرؔ پڑھ کے فرمایا — "پھر ملیں گے اگر خدا لایا"

وہ تو پہلو سے آہ بھر کے اُٹھے — اور ہم بے قرار مر کے اٹھے

جب وہ اِک ایک سے چلے مِل کر — خوب روئے مرے گلے مِل کر

اُدھر اس مہمان کی رخصت — تھی اِدھر میری جان کی رخصت

ساتھ اس کے مری نگاہ گئی — جب نگہ تھک گئی تو آہ گئی

روح کہتی تھی مجھ کو دو رخصت — دل پکارا کہ میں بھی لو رخصت!

دل جگر دونوں تھرتھراتے تھے — پاؤں چلنے میں لڑکھڑاتے تھے

ضعف سے چل سکا نہ چار قدم — اِک قدم راہ تھی ہزار قدم

اشک آنکھوں میں اور لب پر دم — جان جانے کو مستعد ہر دم

صبر ٹھہرائے کب ٹھہرتا ہے — سب سے پہلے سلام کرتا ہے

رات گزری مجھے دعا کرتے — تھک گیا منہ خدا خدا کرتے
کس قدر مضطرب مرا دل تھا — دل نہ تھا صیدِ نیم بسمل تھا

جدائی

اے فلک داد خواہ ہوں تجھ سے — طالبِ رشکِ ماہ ہوں تجھ سے
یہ ستم دیکھ اور مجھ کو دیکھ — یہ الم دیکھ اور مجھ کو دیکھ
وہ نکیلی ادائیں دھیان میں ہیں — وہ سریلی صدائیں کان میں ہیں
گر نہیں وصلِ یارِ جانی کا — لطف کیا ایسی زندگانی کا
ہجر باعث ہے خستہ جانی کا — ہجر دشمن ہے زندگانی کا
ہجر سے زخمِ جانستاں بہتر — ہجر سے مرگِ ناگہاں بہتر
ہجر دنیا سے لے کے جاتا ہے — عاقبت خاک میں ملاتا ہے
دم پہ بنتی ہے ہجر کے غم سے — اس کو پوچھو جنابِ آدم سے
تیرگی ہے جو یہ شبِ غم میں — ہے سیہ پوش میرے ماتم سے
ہوئے سر کھول کر شبِ ہجراں — اشک شبنم سے صبح تک گریاں
اس سیاہی میں کیا سحر ہو نمود — گھر گیا دودِ آتشِ نمرود
دیکھ کر آہِ آتشیں کے شرر — دانت پیسا کئے بہت اختر
داستاں گو ہے نالۂ شبگیر — خوب سوتی ہے چین سے تقدیر
کیوں فلک انتہائے جور بھی کچھ — ظلم باقی رہا ہے اور بھی کچھ
یوں کسی کو ہلاک کرتے ہیں — یوں جلاتے ہیں خاک کرتے ہیں

ہمہ تن یاس کر دیا تو نے — ستیاناس کر دیا تو نے

دل ستانے سے درگزر ہی نہیں — آہِ مظلوم سے حذر ہی نہیں

ہو گئے خاک من چلے لاکھوں — مر گئے کاٹ کر گلے لاکھوں

میں ہی کیا ہوں تری جفا کے لئے — رحم کر رحم کر خدا کے لئے

کسی کروٹ سے کل نہیں آتی — نہیں آتی اجل نہیں آتی

جی بہلتا نہیں کسی صورت — دم نکلتا نہیں کسی صورت

ضعف سے دونوں مل گئے پہلو — چین بستر سے چھل گئے پہلو

چشم نمناک ہے تو دل غمناک — سینہ صد پارہ و جگر صد چاک

تپِ دوری نچوڑتی ہے مجھے — دم بدم روح چھوڑتی ہے مجھے

ضعف سے قلب ٹھہر کر آتا ہے — درد بھی اٹھ کے بیٹھ جاتا ہے

چشم پرخوں سے ندیاں جاری — ریشِ ناخن سے تن پہ گلکاری

چبھتی ہے کوئی شے کلیجے میں — ہوک سی اٹھتی ہے کلیجے میں

دل کی حالت بری ہے سینے میں — سانس چلتی چھری ہے سینے میں

لگ گئی کس کی بد دعا مجھ کو؟ — میرے اللہ کیا ہوا مجھ کو؟

دل سے پہروں کلام کرتا ہوں — زندگی کو سلام کرتا ہوں

غم جاں کاہ میہماں دل کا — اشکِ غماز رازداں دل کا

جب فلک پر نگاہ جاتی ہے — عرشِ اعلیٰ تک آہ جاتی ہے

پہنچی ہے آسماں تک فریاد — نہ گئی اس کے کان تک فریاد

دردِ دل سائبان ہے گویا — دوسرا آسمان ہے گویا

رات دن مجمع پریشانی — خانہ آباد خانہ ویرانی

دل میں ہر آن کاہشِ دوری — لب پہ ہر وقت ہائے مجبوری

دل ہے بیتاب تو جگر بے چین — ہے مصیبت میں گھر کا گھر بے چین

دل میں ہر وقت ایک تازہ ملال — انقلابِ زمانہ شاملِ حال

نامرادی مراد پاتی ہے — تلخ کامی مزے چکھاتی ہے

نامور ہے وہ میری گمنامی — پُر اثر ہے وہ میری ناکامی

یہ جو لکھے قلم زباں نہ رہے — لوحِ محفوظ تک نشاں نہ رہے

بے کسی میری غمگساروں میں — ناامیدی امیدواروں میں

لطف ملتا ہے جان کھونے سے — شاد ہوں رات دن کے رونے سے

چشمِ تر پر ہے گوشہ داماں کا — چاک ہنسنے لگا گریباں کا

لحدِ تنگ کنجِ تنہائی — جیتے جی منہ پہ مردنی چھائی

چارہ گر سے دوا نہیں ہوتی — نہیں ہوتی شفا نہیں ہوتی

درد دل کا علاج مشکل ہے — بچ گئے کل تو آج مشکل ہے

کل جو امید تھی وہ آج نہیں — مرضِ موت کا علاج نہیں

جان جاتی ہے دل کے آنے سے — موت آتی ہے اس بہانے سے

گرد بیٹھے طبیب روتے ہیں — مجھ کو میرے نصیب روتے ہیں

نبضیں چھوٹی ہوئی طبیبوں کی — پیش چلتی نہیں غریبوں کی

ہر کوئی اپنی اپنی کہتا ہے — رائے میں اختلاف رہتا ہے

جو اطبائے وحشتِ دل ہیں — اُن کو کپڑے چھڑانے مشکل ہیں

جو عیادت کو میری آتا ہے ‏ دیکھ کر دور ہی سے جاتا ہے

میری باتوں سے وہم آتے ہیں ‏ سننے والوں کے ہوش جاتے ہیں

بات کی بات میں پلٹ نہ پڑے ‏ یہ سڑی ہے کہیں پلٹ نہ پڑے

مژدۂ وصل کب سناتے ہیں، ‏ لوگ یٰسین پڑھنے آتے ہیں

دشمنِ نام و ننگ کون کہ ہیں! ‏ اپنے جینے سے تنگ کون کہ ہیں!

دشمنِ اضطراب کون کہ ہیں! ‏ مبتلائے عذاب کون کہ ہیں!

تیرِ غم کا نشانہ کون کہ ہیں! ‏ پائمالِ زمانہ کون کہ ہیں!

عاشقِ بےوفا کون کہ ہیں! ‏ سب میں بے اعتبار کون کہ ہیں!

مضطر و ناشکیب کون؟ کہ ہیں! ‏ صیدِ دامِ فریب کون کہ ہیں!

چشم براہِ یار کون کہ ہیں! ‏ ہمہ تن انتظار کون کہ ہیں!

تیغِ حسرت اتر گئی دل میں ‏ بے قراری ٹھہر گئی دل میں!

اشک اُمڈے برس گئیں آنکھیں ‏ دیکھنے کو ترس گئیں آنکھیں

شوق کہتا ہے میرے ساتھ آؤ ‏ ضعف کہتا ہے بیٹھ ہی جاؤ

چین ملتا نہیں کہیں مجھ کو ‏ آسماں ہو گئی زمیں مجھ کو

موت آئے یقیں نہیں آتا ‏ نفسِ واپسیں نہیں آتا

اب کہاں وہ صفائیاں منہ پر ‏ چھٹ رہی ہیں ہوائیاں منہ پر

رنج کھاتا ہوں اشک پیتا ہوں ‏ یہی کھا پی کے روز جیتا ہوں

جتنے ارمان ہیں میرے دل میں ‏ سب وہ پیکان ہیں مرے دل میں

کھیل کوئی نہ عمر بھر کھیلے ‏ ہم جو کھیلے تو جان پر کھیلے

پھوٹ کر روئے پاؤں کے چھالے ۔۔۔ بہہ گئے جن سے ندیاں نالے
گر ہوں رہ کشش بہ وضعِ پیہم ۔۔۔ پانی پانی ہو گریۂ آدم
رنج کھانے سے کام ہے مجھ کو ۔۔۔ دانہ پانی حرام ہے مجھ کو
فکر افشائے راز سے خاموش ۔۔۔ کبھی کچھ ہوش میں کبھی بے ہوش
الفراق الفراق وردِ زباں ۔۔۔ الاماں الاماں یہ شور فغاں
جو فرشتے ہیں آسمانوں پر ۔۔۔ ہاتھ رکھے ہوئے ہیں کانوں پہ
غمِ دوری سے جان بیکل ہے ۔۔۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے

کوئی مہماں جو میرے گھر آیا ۔۔۔ میں نے جانا پیامبر آیا
لیں بلائیں ہزار ہا میں نے ۔۔۔ دیں دعائیں ہزار ہا میں نے
اس کو باتوں میں کھوتا تھا میں ۔۔۔ خط کمر میں ٹٹولتا تھا میں
کبھی پیتا تھا پاؤں دھو دھو کر ۔۔۔ کبھی ہنستا تھا خوب رو رو کر
کبھی قدموں پہ اس کے گرتا تھا ۔۔۔ کبھی میں اس کے گرد پھرتا تھا
خیرِ یار پوچھتا تھا میں ۔۔۔ حالِ اغیار پوچھتا تھا میں
رنگ کیا ہے امیدواروں کا ۔۔۔ ڈھنگ کیا ہے صلاح کاروں کا
کون سے شخص پر عنایت ہے ۔۔۔ رات دن کس سے گرم صحبت ہے
سنتے ہیں داستانِ غم کہ نہیں ۔۔۔ یاد آتے ہیں اُن کو ہم کہ نہیں
کس سے ہر وقت ہم کلامی ہے؟ ۔۔۔ کون سرکار کا سلامی ہے؟
بزم آرائیوں کا شوق بھی ہے؟ ۔۔۔ اب وہ شعر و سخن کا ذوق بھی ہے؟

ہیں طبیعت میں ولولے کیا کیا؟ — رات دن کے ہیں مشغلے کیا کیا؟
میہماں حُسن کے یہ مری تقدیر — تھا تحیّر میں صورتِ تصویر
اس کو حیرت یہ ماجرا کیا ہے؟ — میزباں کو جنوں یہ سودا ہے!
میری حالت پہ اس کو سکتا تھا — شکل آئینہ منہ کو تکتا تھا
نظر آئی جو اس کی حیرانی — سخت مجھ کو ہوئی پشیمانی
کون مہماں ہو کے آئے گا — یوں تلاشی جو دے کے جائے گا
ہوش آیا تو شرمسار ہوا — پھر وہی جوشش انتظار ہوا

عاشق کی تصویر سے معشوق کی مخاطبت!

یہ سنا ہے کہ وہ پری پیکر — یاد کرتا ہے مجھ کو یوں اکثر
میری تصویر رکھ کے پیش نظر — کوسنا چھیڑنا یہ کہہ کہہ کر
اس ڈھٹائی سے تو اِدھر دیکھے — آنکھیں پھوٹیں میں اگر دیکھے
کس طرح گھورتا ہے بے شرم! — جی میں آتا ہے پھونک دوں تصویر!
تو سہی، رات دن رلاؤں تجھے! — دیکھنے کا مزا چکھاؤں تجھے!
ایسی صورت پہ یہ دماغ ترا! — خوب رکھا ہے نام داغ ترا!
حُسن ہوتا ہے حاصلِ تصویر! — روسیہ! تو ہے قابلِ تصویر؟
شکل منحوس کیوں نظر آئے؟ — مول لے کر بھی ہم تو پچھتائے!
ایسی تصویر کس کو بھاتی ہے — پر بلا سے، ہنسی تو آتی ہے
تجھ سے رونق نہیں ہے گھر کے لئے — رکھ لیا ہے نظر گزر کے لئے!

نہ ہو کچھ اس سے رونقِ تعمیر — اور دھبّہ لگائے یہ تصویر!

تو ہے رنج و ملال میں کس کے — چپ لگی ہے خیال میں کس کے

کیوں ہے خاموش لب تو کھول ذرا — وہ بڑے بول اب تو بول ذرا!

لن ترانی کہاں گئی تیری — خوش بیانی کہاں گئی تیری

آرزوئے وصال کہہ تو سہی؟ — کیا ہُوا تیرا حال کہہ تو سہی؟

جھوٹ سچ ہمکو آزمانا ہے — عشق ہے یا فقط بہانا ہے

تیرے منہ میں زبان ہے کہ نہیں — تجھ میں کمبخت جان ہے کہ نہیں؟

کونسا تھا وہ آئینہ رخسار — تجھ کو سکتے کا دے گیا آزار

آئینہ تیرے منہ پہ رہتا ہے — اس سے کیا اپنا حال کہتا ہے؟

دام دے کر تجھے خریدا ہے! — تجھ پہ ہر طرح اپنا دعویٰ ہے!

ہاں زلیخا مجھے نہ ٹھہرانا! — بن کے یوسف کہیں نہ اترانا!

بال باندھا مرا غلام ہے تو — اسی باعث سے نیک نام ہے تو

طائرِ رنگ اُڑ کے چل نہ سکے — تیری حسرت کبھی نکل نہ سکے

بھاگ کر بے وفا نہ ہو جانا — محض نا آشنا نہ ہو جانا

نہ کہیں گے کہ صورت اچھّی ہے — ہاں مگر کچھ طبیعت اچھّی ہے

تیری تصویر کا بہانا ہے — تیرا خاکہ بہت اڑانا ہے

پہلے تو اس کو چاک چاک کروں! — اور پھر میں جلا کے خاک کروں!

کیا یہ تصویر لاجواب نہیں — سو میں ایک کا جواب نہیں!

ان کی تصویر پہ نظر ہر دم — تجھ کو تقدیر پہ نظر ہر دم

معشوقہ کی آمد

صورت نامہ و پیام رہی | خط کتابت کی دھوم دھام رہی
اُن کو لکھا بطور استمزاج | سارے میلوں سے ہے یہ بڑھ کر آج
دیکھو تم سب بے نظیر کے جلسے! | ہر برس ہو شریک اوّل سے!
تم نے بھی رنگ اس کے دیکھے ہیں! | تم نے بھی ڈھنگ اس کے دیکھے ہیں!
کچھ رہو رام پور میں آ کر! | لطف اٹھاؤ! حضور میں آ کر!
پر یہ ہے شرط آ کے میلے میں | پھنس نہ جانا کسی جھمیلے میں!
اُن کی مجھ کو جواب میں تحریر | اپنے آنے کے باب میں تحریر
ایسے میلے ہیں کیوں نہ آئیں ہم | کہ جہاں تم سا شخص پائیں ہم
کوئی عیب دکھانے والا ہو | کوئی ہم کو بلانے والا ہو
بے بلائے جو آئے کیا آئے | منہ اٹھائے جو آئے کیا آئے
کیا نہیں ہم کو شوق خوب کہی | کیا نہیں ہم کو ذوق خوب کہی
باغ کی ہم بہار لوٹیں گے | داغ کی ہم بہار لوٹیں گے
سب یہ کہتے ہیں سیر بہتر ہے | ہم بھی سمجھے تو خیر بہتر ہے
فائدہ کیا ہے ہم کو جھیلے سے | آئیں گے پر اسی وسیلے سے
تم ور اندازیوں کو کیا جانو! | تم فسوں سازیوں کو کیا جانو!
فتنہ پردازیاں بھی ہوتی ہیں | رخنہ اندازیاں بھی ہوتی ہیں،
تم کو اس کی خبر بھی ہے کہ نہیں | نیک و بد پر نظر بھی ہے کہ نہیں

جن سے تم التجائیں کرتے ہو / ہر طرح کی وفائیں کرتے ہو!

تم سمجھتے ہو وہ خلاف نہیں / وہ ذرا تم سے دل میں صاف نہیں

کہیں بدظن بھی دوست ہوتے ہیں / کہیں دشمن بھی دوست ہوتے ہیں

باز آئے ہم ایسے آنے سے / کہ بند ہیں مورچے زمانے سے

خط پہ خط بے سبب نہیں آتے / جب تو آتے پر اب نہیں آتے

رسم و راہ پیام سے گزرے / اس پیام و سلام سے گزرے

ایک صاحب جنھوں نے روکا تھا / اُن کو مدِ نظر تماشا تھا

کوئی دن داغ کو جلائیں ہم / اس جلانے کے لطف پائیں ہم

گر رقابت کا واسطہ ہوتا، / تو خدا جانے کیا سے کیا ہوتا

بے سبب جن کو یہ عداوت ہو / واسطہ ہو تو کیا قیامت ہو

مجھ کو صبر و قرار مشکل تھا / طبع پر اختیار مشکل تھا

ہے عجب شئے امیدواری بھی / لطف دیتی ہے بے قراری بھی

خبر دل ربا نہیں آتی / اس طرف کی ہوا نہیں آتی

مژدۂ جاں فزا نہیں سنتے / ہم خوشی کی صدا نہیں سنتے

گوش زد ایک نوید تھی ہر روز / وہ گئے دن کہ عید تھی ہر روز

دل دکھانے سے کام ہے تجھ کو / اے محبت سلام ہے تجھ کو

مصلحت جان کر گلا چھوڑا / جذبِ دل پر معاملہ چھوڑا

کفِ افسوس کس طرح نہ ملے / آدمی کیا کرے جو بس نہ چلے

میں نے سوچا یہ امر ادنیٰ ہے / وہ بلا ہیں جنھوں نے روکا ہے

اُن کی کس کس طرح اطاعت کی　　پھر انہوں نے بھی یہ عنایت کی

صاف دل سے مرا سلا بھیجا　　کہ بنارس انہیں بلا بھیجا

آئے جس وقت وہ بنارس ہیں　　میں نے جانا کہ آ گئے بس ہیں

میری تقدیر اُن کو لے آئی　　میری تدبیر ان کو لے آئی

جا کے عہدِ شباب کا آنا!　　تھا دوبارہ حجاب کا آنا!

کیا مرے دلستاں کا آنا ہے　　یہ تو روحِ رواں کا آنا ہے

نکہتِ گل اِدھر پلٹ آئی　　عمرِ رفتہ مگر پلٹ آئی

تھا یہ اس رشکِ حور کا آنا　　چشمِ اعمیٰ میں نور کا آنا

تھا یہ اس گلعذار کا آنا　　یا نسیمِ بہار کا آنا

پھر وہی ساعتِ سعید آئی　　کہ برس دن کے بعد عید آئی

میرے معجز بیاں کا آنا ہے　　یا مسیحِ زماں کا آنا ہے

لعل نکلا ہے یا بدخشاں سے　　ماہِ کنعاں چلا ہے کنعاں سے

بزم میں شمعِ انجمن آئی　　یا بہارِ گلِ چمن آئی،

میرے غمخوار جا کے لائے نہیں　　نہ ہی کچھ بغیر آئے نہیں

میں نے پایا جو اپنے دلبر کو　　آبِ حیواں ملا سکندر کو

ایسی دولت نصیب ہو کس کو　　گنجِ قاروں ملا ہے مفلس کو

میرے یوسف کی دھوم پیہم ہے　　مصر سے رام پور کیا کم ہے

آئے لیکن ہزار ناز کے ساتھ　　ملے مجھ سے تو احتراز کے ساتھ

وہم بھی بے قیاس تھا ان کو　　پاس والوں کا پاس تھا ان کو

لے لی چٹکی سے دل میں چٹکی بھی — پھر تشفی بھی پھر تسلی بھی
پہلے کچھ بات کی تو رک رک کر — پھر کہا میرے کان میں جھک کر
کیا نہیں حسرتِ وصال ہمیں — وضع داری کا ہے خیال ہمیں
ہم جو آئے یہ دل ہمارا تھا — ورنہ کیا آپ کا اجارا تھا
جب لیا نام وضع کا اس نے — پی گیا سن کے جو کہا اس نے
کھل گئے کان جب سنی ایسی — گھل گئی جان جب سنی ایسی
بجھ گیا دل انار سا چھٹ کر — رہ گیا سینہ میں دھواں گھٹ کر
خوفِ اغیار پہ ہنسی آئی — اُن کے انکار پر ہنسی آئی
میں نے کی عرض یہ بجا یہ درست — آپ نے جو کہا، کہا یہ درست
بات مطلب کی میں کہوں! توبہ! — اپنے مہماں کو رنج دوں توبہ
اپنے سر کیوں دھروں پرائی بات — کیوں بگاڑوں بنی بنائی بات
کام مجھ کو تو ہے اطاعت سے — کیا غرض شکوہ و شکایت سے
ابھی کیا جانو! وضعداروں کو — دیکھ لوگے وفا شعاروں کو!
وضع نبھتی ہے وضعداروں سے — یا اطاعت کے خواستگاروں سے
وہ کہیں پاسِ وضع کرتے ہیں — جو یہ جانیں یہ ہم پہ مرتے ہیں
طور سب غیر غیر دیکھو گے — چار دن بعد سیر دیکھو گے
میرے کہنے کی داد دو گے تم — نام ان کا کبھی نہ لو گے تم،
صبر میں نے کیا ہے بس دن تک — کیا قیامت ہے اور دس دن تک
دل کو جو تیری یاد دیتا ہے — صبر کی وہ بھی داد دیتا ہے

اِک جہاں اپنا دیکھا بھالا ہے　　جانتا ہوں جو ہونے والا ہے

واپسی

چار دن میں یہ اتفاق کی بات　　اُن سے ایسی ہوئی نفاق کی بات
پیش آئی جو امتحاں میں نہ تھی　　وہ پڑی شکل جو گماں میں نہ تھی
نازنینوں سے زمیاں بہتر　　نہیں ہوتی ہیں گو میاں بہتر
نہ کسی کو بُرا کہے نہ سُنے　　عمر بھر جو الف سے بے نہ سنے
کوئی جھڑکی نہ کوئی گالی تھی　　اک شکایت منہ سے خالی تھی
دل شکایت سے ٹوٹ جاتا ہے　　جی محبت سے چھوٹ جاتا ہے،
اس شکایت نے یہ قباحت کی　　کہ بڑھیں رنجشیں قیامت کی
نشۂ زور و زر کی سرمستی　　اور پھر کس قدر زبردستی
اس کو غصہ آئے یہ خدا نہ کرے　　وہ بِگڑ جائے یہ خدا نہ کرے
منہ سے جب بات پر نہیں نکلی　　دل سے پھر عمر بھر نہیں نکلی
آدمی کچھ غرض سے دبتا ہے　　جب اٹھائے طمع تو پھر کیا ہے
بات کا زخم کوئی بھرتا ہے　　آبرو دار اس سے مرتا ہے
یہ گرہ دل سے کب نکلتی ہے　　جان جاتی ہے جب نکلتی ہے
لوگ چالیں ہزار چلتے ہیں　　توبہ توبہ یہ بل نکلتے ہیں
کوئی ایسوں کی دال گلتی ہے　　پیش کب ہر کسی کی چلتی ہے
جب ادا ہی نہ ہو سکے جی سے　　فائدہ کیا قضائے عمری سے

شاد رہنے سے شاد رہتا ہے
ورنہ پھر نامراد رہتا ہے

کوئی نازک مزاج دبتے ہیں؟
صاحبِ احتیاج دبتے ہیں

اپنے حق میں یہ زہر گھول لیا
طعنے دے دے کے رنج مول لیا

ایسی بگڑی کہ آج تک نہ بنی
ایسی چھٹی کہ آج تک نہ بنی

کسی جانب سے تھا ملال انہیں
کسی جانب سے انفعال نہیں

پھر تو وہ ٹوٹ کر ادھر آئے
دام سے چھوٹ کر ادھر آئے

یہ کہا اب وہ دل کہاں اپنا
تھا غلط سر بسر گماں اپنا

پاس ان کا کیا! ہمیں چوکے!
کیوں کیا؟ کیا کیا؟ ہمیں چوکے!

کیا زمانے نے رنگ بدلا ہے
ابتدا کیا تھی انتہا کیا ہے

آگئے کیا ایسے ذکر چھیڑوں میں
گڑے مردے عبث اکھیڑوں میں

گزری اوقات عیش و عشرت سے
دو مہینے تک ایک صورت سے

دوست اپنا وہ مجھ کو جان گئے
میرے کہنے کو دل میں مان گئے

پھر یہ سمجھے کہ اپنا گھر ہے بھلا
عقل مندوں کی داغ دور بلا

بولے میری بلا قفس میں رہے
آدمی کیوں پرائے بس میں رہے

قید خانہ ہے رام پور مجھے
جلد رخصت کریں حضور مجھے

ایک انداز سے ہوئے رخصت
بڑے اعزاز سے ہوتے رخصت

کیا کہوں میں کہ کس چلن سے رہے
رہے جب تک وہ بانکپن سے رہے

پھر وہ سمجھے یہ مر ہی جائے گا
ڈوب جائے گا زہر کھائے گا

آؤ اس کی تسلیاں کر دیں
جی میں جو کچھ ہے وہ بیاں کر دیں

مجھ سے کہنے لگے سنو صاحب! — اس قدر مضطرب نہ ہو صاحب
صبر کا پھل ضرور پاؤ گے! — اس کی راحت بہت اٹھاؤ گے!
اب تو اپنے وطن کو جائیں گے — آؤ گے بھی؟ اگر بلائیں گے!
بات کا موقع و محل دیکھو — کیا زمانہ ہے آج کل دیکھو
وہ جو دم دوستی کا بھرتے ہیں — تم سے درپردہ رشک کرتے ہیں
ڈر ہے دشمن کی دوستداری سے — کام لازم ہے ہوشیاری سے
دم دلاسے وہ مجھ کو دے کے گئے — مجھ سے آنے کا عہد لے کے گئے
چلتے چلتے کہا خدا حافظ — اب تمہارا مرا خدا حافظ!
صبح کو وہ ادھر سوار ہوئے — ہم اجل کے اُمیدوار ہوئے
زندگی بھر یہ کب ہوا صدمہ — پہلے کیا تھا جو اب ہوا صدمہ

گو سراسر ملال تھا وہ ہجر
اس کے آگے وصال تھا وہ ہجر

بلاوا

سنیے خوبی مرے نصیبوں کی! — کہ بن آئی وہاں رقیبوں کی
اپنے بیگانے گھیرتے ہیں اُسے — میرے رستے سے پھیرتے ہیں اُسے
ہوئے دس بیس رخنہ گر پیدا — کئے سو فتنے لاکھ شر پیدا
بنے اس کے مشیر وہ انسان — آئے جن کے فریب میں شیطان
یہ لگایا بلاؤ تو ان کو — تم کبھی آزماؤ تو ان کو

دیکھیں کیسے ہیں چاہنے والے
رسمِ الفت نباہنے والے

کتنے پانی میں ہیں ذرا دیکھو
وہ نہ آئیں گے تم بلا دیکھو

چاہتے ہیں تو اڑ کے آئیں گے
ورنہ ہر طرح ہچکچائیں گے،

تم کو بھولا جو دیکھ پایا ہے
کہہ دیا لوٹ کر دل آیا ہے

تم نے دیکھا ہے کیا زمانے کا
داغ ہے چالیسا زمانے کا

سحر آمیز اس کی باتیں ہیں
درد آمیز اس کی باتیں ہیں

یہ ہے کیا بات سوچیئے اس کو
منہ لگایا ہے آپ نے کس کو

ایسے معشوق کب نصیب اُسے
مل گئے ایک تم عجیب اُسے

ایسی تقدیر ہے کہاں اس کی
تم کرو پاسداریاں اس کی

کبھی کیجئے تو امتحانِ وفا
راست ہے یا غلط گمانِ وفا

ہو بُرا ان لگانے والوں کا
جھوٹی سچی لگانے والوں کا

کب شرارت سے باز آتے ہیں
آگ پانی میں یہ لگاتے ہیں

کہا سننا ہے کینہ خواہوں کا
جم گیا رنگ روسیاہوں کا

کچھ کدورت سی آ گئی اس کو
اور بھی کچھ سما گئی اس کو

جب سنی ہر شریر کی تقریر
ہو کے خاموش صورتِ تصویر

دل میں سوچا یہ وہ بتِ ناکام
دُور بیٹھے ہوں کس لئے بدنام

بھیج کر خط بلایئے ان کو
واقعی آزمایئے اُن کو

نامہ میری طلب میں آ ہی گیا
جس سے میں اک غضب میں آ ہی گیا

معشوق کا خط

مجھ کو لکھا کہ اے مرے بیتاب | دن کو بے چین رات کو بے خواب
اے پریشان و مضطر و ناشاد | تیرے دل میں رہی ہماری یاد
اے سزاوارِ جور بے تقصیر | اے طلب گارِ لذتِ تعزیر
تازگی بخش نامِ ذوق نصیر | رشکِ سودا و دردؔ و مومن و میر
اے سخن گوئے عیسوی اعجاز | اے سخن سنج سامری انداز
تو گرفتارِ بندِ زلف رہے | دل اسیرِ کمندِ زلف رہے
دردِ الفت سے لب پہ شیون ہو | میری کاکل ہو تیری گردن ہو
ناوکِ ناز کا شکار رہے | تیغِ ابرو سے دل فگار رہے
لب معجز بیاں سے دم نکلے | تیرے دل سے نہ میرا غم نکلے
ہو مبارک یہ پیارا پیارا عشق | راس آئے تجھے ہمارا عشق
ہم نئی بات روز سنتے ہیں | تازہ اک واردات سنتے ہیں
کوئی کہتا ہے بے قرار تمہیں | کوئی کہتا ہے اشکبار تمہیں
کوئی کہتا ہے چپ لگی ہے انہیں | سخت دشوار زندگی ہے انہیں
کھاتے ہیں پیتے ہیں نہ سوتے ہیں | مفت رو رو کے جان کھوتے ہیں
کوئی کہتا ہے نالے کرتے ہیں | کوئی کہتا ہے تم پہ مرتے ہیں
بھر گئے کان حال سن سن کر | ذکرِ رنج و ملال سن سن کر
سن کے یہ حال ہر زباں سے ہم! | لائیں پتھر کا دل کہاں سے ہم

یاد ہے قول اس زمانے کا
تم نے وعدہ کیا تھا آنے کا

کس سے مل کر خوشی میں پھول گئے
تم یکایک جو ہم کو بھول گئے

بڑے خوش خلق و نیک ہو تم تو!
دلّی والوں میں ایک ہو تم تو!

ہم یہاں تم وہاں تو لطف نہیں
ہو یہ دوری جہاں تو لطف نہیں

لوگ کہتے ہیں وہ تڑپتے ہیں
ایسے ہوتے ہیں جو تڑپتے ہیں

چین سے اپنے گھر میں رہتے ہو
بزم والا گہر میں رہتے ہو

رسمِ الفت نباہتے ہو اگر
جان کی خیر چاہتے ہو اگر

اٹھ کے سیدھے ادھر چلے آؤ
کوئی روکے مگر چلے آؤ!

ریل میں اتنی دور آنا کیا
کار سرکار کا بہانا کیا

ہم بلائیں نہ آئیں آپ پہ خوش
اور اس پر رہے ملاپ پہ خوش

یہ جگہ سیرگاہِ عالم ہے!
آج اس پر نگاہِ عالم ہے!

میہماں تم ہو میزباں ہم ہوں
عیش و عشرت کے لطف باہم ہوں

جب کسی نے طلب کیا آئے
آئے پچتا کے پھر تو کیا آئے

دلبروں سے دغا نہیں کرتے
ایسے اہلِ وفا نہیں کرتے

گر کسی اور راہ سے ہو گا
عذر بدتر گناہ سے ہو گا

نامۂ دلنواز جب آیا
میں نے سوچا یہ کیا غضب آیا

دل تو کہتا تھا سر کے بل چلئے
جس طرح ہو سکے نکل چلئے

شکل چلنے کی آہ کچھ نہ بنی
وضع تھی سدِّ راہ کچھ نہ بنی

کار سرکار نے جو آ گھیرا
قدم اُٹھ اُٹھ کے رہ گیا میرا!

ملتی ہے کام سے کہیں فرصت　　مجھ کو مرنے کی بھی نہیں فرصت

رات دن رنج میں گذرتی ہے　　اک کشش و پنج میں گذرتی ہے

عذر کیجے یہ بات مشکل ہے　　جائیے تو نجات مشکل ہے

نکتے نکتے پہ ہے خیال اسے　　ہو نہ جائے کہیں ملال اسے

آفتِ روزگار ایک طرف　　اس کے دل کا غبار ایک طرف

منزلِ دوست دور آتی ہے　　ریل بھی تھک کے چیخ اٹھتی ہے

شکل کیسی پڑے خدا معلوم　　کیا ہو انجامِ کار کیا معلوم

سوچتا تھا جواب کیا لکھوں　　قہر ٹوٹے جو مدعا لکھوں

فکرِ مضمون میں غرق تھا پہروں　　ہاتھ میں خامہ رہ گیا پہروں

قصد جانے کا دل میں ٹھان لیا　　مجھ کو جانا پڑا یہ جان لیا

نامہ اختر جواب میں لکھا　　کچھ کا کچھ اضطراب میں لکھا

جواب

یا خدا! وہ فرشتہ بھجوا دے　　کہ مرا نامہ اس کو پہنچا دے

کاش میرا ہی کاتبِ اعمال　　اس کو جا کر سنائے حالِ ملال!

کوئی جلتے جو گرد باد ادھر　　جاؤں میں اس کے ساتھ اڑ اڑ کر

اے فغاں اپنے زور میں لے چل　　پہنچوں مکتوبِ شوق سے اول

اے مہ و مہر و گردشِ ایام!　　تمہیں پہنچا دو! چلتے پھرتے پیام

ہے کدھر قاصدِ سلیمانی　　کہے اس سے مری پریشانی

اے ہوا! بازوؤں میں تو بھر کے
کھول دے پر مرے کبوتر کے!

لے چل اے چرخ تو بھی نامۂ یار
کہ نہ جائیں یہ گردشیں بیکار

ابرِ تر! اشک تر کو تو لے جا!
برق سوزِ جگر کو تو لے جا!

یوں ہمارا سلام پہنچانا!
یوں ہمارا پیام پہنچانا!

اے مری جان! جان سے بہتر
جان سے کیا؟ جہاں سے بہتر

اے مہِ آسمانِ زیبائی!
جانِ خوبی جہانِ زیبائی!

اے بُتِ لاجواب میں صدقے!
اے سراپا حجاب میں صدقے!

شوخ رُو، شوخ چشم، شوخ کلام
خوش ادا، خوش خرام، خوش اندام

مجھ کو تیرے رُخِ نکو کی قسم!
اپنے ارمان و آرزو کی قسم!

تیرے اقرار دمبدم کی قسم!
عہد کی قول کی قسم، کی قسم!

اپنے آزار و رنج و غم کی قسم!
داغ کے درد کی الم کی قسم!

تیرے قدموں کی تیرے سر کی قسم!
اپنے دل کی قسم، جگر کی قسم!

مصحفِ روئے پُر ضیا کی قسم!
جھوٹ کہتا نہیں خدا کی قسم

تو ہے اے مہ جمال پیشِ نظر!
ہے ترا ہی خیال پیشِ نظر!

سامنے دوسرا نہیں آتا!
آئینہ دیکھنا نہیں آتا!

بھول کر تجھ کو میری یاد آئی!
دلِ ناشاد کی مراد آئی!

نہیں کہتا ہوں میں خوشامد سے
تیرے احسان بڑھ گئے حد سے!

اس قدر دھیان کون کرتا ہے!
ایسے احسان کون کرتا ہے!

یہی اک دن تری قسم ہو گا
کہ مرا سر ترا قدم ہو گا!

تجھ سے انصاف چاہتا ہوں میں
چشمِ الطاف چاہتا ہوں میں

آفتیں جتنی ہیں جدائی میں
میں نے جھیلیں تری جدائی میں

زندگانی سے یاس ہے مجھ کو
تیرے ملنے کی آس ہے مجھ کو

گو زمانہ ہو چاہنے والا
نہیں مجھ سا نباہنے والا

تم بلاؤ نہ آؤں کیا ممکن
ہے سراسر یہ بات ناممکن

میری عزت کو تم بھی جانتی ہو!
میری غیرت کو تم بھی جانتی ہو!

رب ہے تیری آرزو بڑھ کر
آرزو سے ہے آبرو بڑھ کر!

رشک اٹھا کر مجھے نہ مرنا ہو
زہر کھا کر مجھے نہ مرنا ہو

یہ نگاہیں کہیں نہ پھر جائیں
ہم نظر سے تری نہ گر جائیں!

بات کب ناگوار اٹھتی ہے
داغ ہے کس کی عار اٹھتی ہے

داغ کھاؤں خدا وہ دن نہ کرے
رشک کھاؤں خدا وہ دن نہ کرے

خونِ دل عاقبت نہ ہو جائے
سفرِ آخرت نہ ہو جائے

آدمی آبرو نہ کھو کے رہے
کیا رہے گر حقیر ہو کے رہے

داغ دُرِّ عدن سے بہتر ہو
یہ مسافر وطن سے بہتر ہو

میں اٹھاؤں وہ اس سفر کے مزے
بھول جاؤں تمام گھر کے مزے

اہلِ تمیز مانتے ہیں مجھے
جاننے والے جانتے ہیں مجھے

رونق آرائے بزم میں ہی تو ہوں
زینت افزائے بزم میں ہی تو ہوں

یہ سر احسان سے نہیں واقف
یہ دل ارمان سے نہیں واقف

سر جھکا ہے وہیں خدا آگاہ
اس جبیں پر ہے خاکِ بیت اللہ

اسی ابرو کے وہ اشارے ہیں
جس پہ قربان ماہ پارے ہیں

ان نگاہوں کو کوئی کیا جانے
میری آنکھوں سے دیکھنا جانے

وہ طبیعت کہ جس میں خوئے وفا
یہ وہ بینی جو سونگھے بوئے وفا

لب سے ہر دم یہ کام لیتا ہوں!
کہ تمہارا ہی نام لیتا ہوں

کبھی سرگرم التجا نہ ہوئے
حرفِ مطلب سے آشنا نہ ہوئے

مفت کی قیل و قال کیا جانیں
لب ہمارے سوال کیا جانیں

لب کھلے تو تری دعا کے لئے
کب کھلے حرفِ مدعا کے لئے

اس زبان سے کلام کو رونق
اس بیان سے پیام کو رونق

اس زباں میں بیان کی شوخی
اس بیاں میں جہان کی شوخی

کبھی اس کان سے بدی نہ سنی
بات اچھی سنی بری نہ سنی

یہ وہ گردن نہ جو خمیدہ رہے
اپنے بیگانے سے کشیدہ رہے

بارِ احسانِ غیر زائل ہو
دستِ معشوق ہی حمائل ہو

آئینہ گرد میرے سینے سے
کہ یہ سینہ ہے پاک کینے سے

مخزنِ علم داغ کا دل ہے
معدنِ حلم داغ کا دل ہے

انتخابِ زمانہ ہے یہ جگر
پر تمہارا نشانہ ہے یہ جگر

ہاتھ پیدا ہوئے عطا کے لئے
پاؤں ہیں منزلِ وفا کے لئے

ہے یہ دربار شاہ کا صدقہ
اسی عالم پناہ کا صدقہ

اسی سرکار سے ہوئی تعلیم
اسی دربار سے ہوئی تعلیم

نیک و بد سب جتا دیا تم کو
حالِ اپنا بتا دیا تم کو

میں نہ لکھتا کبھی مگر لکھا
قدرداں تم کو جان کر لکھا

یہ دعا ہے کہ برقرار رہو
میرے حق میں وفا شعار رہو

تم کو اللہ شادمان رکھے
عمر بھر مجھ پہ مہربان رکھے

داغ کی یاد میں حجاب رہے
ساتھ شوخی کے اضطراب رہے

خط روانہ ادھر شتاب کیا
اس طرف میں نے بار آب کیا

یا خدا میری منزل آساں ہو!
منزل آساں ہو مشکل آساں ہو

کلکتہ کو جانا

مل گئی جب حضور سے رخصت
میں ہوا رام پور سے رخصت

کہہ کے اٹھا اخیر یا قسمت
راہ رو میں تو رہنما قسمت

جا کر اپنے وطن میں جی نہ لگا
اس بنائے کہن میں جی نہ لگا

چل کے دلی سے لکھنؤ پہنچا
ہمہ تن شوق و آرزو پہنچا

بہت اجڑے ہوئے مکاں دیکھے
مٹنے والوں کے کچھ نشاں دیکھے

کچھ جو ارمان تھا نکال لیا
شہر کو خوب دیکھ بھال لیا

خوب انجم نے میہمانی کی
اور بھی سب نے مہربانی کی

راہ میں کان پور، الہ آباد
میں نے دیکھے مگر نہ حسب مراد

استے میں آگیا عظیم آباد
تھا مجھے اس کا شوق حد سے زیاد

پیشوائی کے واسطے احباب
آئے تھے شوقِ دید میں بیتاب

بہت اشخاص یک بیک آئے
اپنی اپنی سواریاں لائے

کوئی مجھ کو لئے ہی جاتا تھا — کوئی ناحق کا حق جتاتا تھا
کوئی کہتا تھا میرے گھر چلئے — آئیے اس طرف ادھر چلئے
ہوئی لوگوں کی چپقلش کیا کیا — رہی آپس میں کشمکش کیا کیا
مجھ کو یہ فکر تھی کہ بھیڑ چھٹے — میرزا شاغل[۱] آئے جب وہ ہٹے
یہ وہ ہیں نام خلق ہے جن سے — آدمیت مراد ہے ان سے
متقی پارسا بہت دیکھے — خوش بیاں خوش ادا بہت دیکھے
خوش گلو بھی کئی سنے ہیں نے — خوبرو بھی کئی جچے ہیں سنے
مجھ کو فرصت ملی ہزاروں سے — روز ملتا تھا میں ہزاروں سے
ایسی خلقت کہیں نہیں دیکھی — یہ مروت کہیں نہیں دیکھی
کیسی مہماں نوازیاں دیکھیں — کس قدر جاں نوازیاں دیکھیں
ان کے اخلاق یاد ہیں مجھ کو — ان کے اشفاق یاد ہیں مجھ کو
دیں وہ مہماں کو جس قدر چاہیں — بخشدیں گھر کا گھر اگر چاہیں
میر باقر کے گھر قیام ہوا — خوب دعوت کا اہتمام ہوا
آٹھ دن دیکھی سیر پٹنے کی — یہ ہوئی وجہ جی اچٹنے کی
کیا قیامت تھی شہر کی گرمی — کاش گنگا میں ڈوبتی گرمی
آگ کی طرح آب میں گرمی — مثل اخگر حباب میں گرمی
طبع گرمی سے کیوں نہ عاری ہو — جائے نوری وہاں تو ناری ہو
بے جلے کوئی استخواں نہ رہے — عنصر آب کا نشاں نہ رہے

---

[۱] آغا مرزا شاغل برادر اخیافی داغ

رنگ جل جل کے ہو گئے کاجل　　جل گئے لے چلے جو گنگا جل
شعلہ زن ہو تنور طوفان بھی　　کانپتا ہے یہاں زمستان بھی
رنگت آخر طپش سے زرد ہوئی　　گرمیٔ جلسۂ داغ سرد ہوئی
سوئے کلکتہ میں روانہ ہوا　　دور تک ساتھ اک زمانہ ہوا
شوقِ بے اختیار لے ہی گیا　　یہ دلِ بے قرار لے ہی گیا
آئی ایسی ہوائے کلکتہ　　دل پکارا کہ ہائے کلکتہ
ریل پر دوستانِ نیک خصال　　آئے اکثر برائے استقبال
شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا　　داغ آیا تو باغ باغ آیا!
دیکھ کر شہر کھل گئیں آنکھیں　　ماہ رویوں پہ ڈھل گئیں آنکھیں
سرِ بازار وہ مکان بلند　　جس کو کہیے اک آسمان بلند
چرخ کو رتبہ اس مکاں سے کہاں　　دور بھاگا ہے یہ کہاں سے کہاں
شرم و غیرت سے چھپ گئی جنت　　ورنہ یہ قصر دیکھتی جنت
ہم جو بالائے بام رہتے تھے　　لوگ عالی مقام کہتے تھے،
سامنے ناخدا کی مسجد تھی،　　ناخدا کیا؟ خدا کی مسجد تھی!
مظہرِ نور ہے یہی مسجد　　بیت معمور ہے یہی مسجد
اثرِ سرمہ اس کی خاک کرے　　جلوہ اس کا نظر کو پاک کرے
اس کا جلوہ سرور آنکھوں کا　　اس کا دیدار نور آنکھوں کا
بخت بیدار و یار ہے دمساز　　اے شبِ وصل تیری عمر دراز
صبح سے شام تک جمال کے لطف　　شام سے صبح تک وصال کے لطف

غم کی راتیں نہ تھے ملال کے دن
کیا پھرے تھے شبِ وصال کے دن

وصل کی شب میں جلوے تھے دن کے
سرمہ تھے حلق میں موذن کے

عیش و عشرت کی بات بات اچھی
رات سے دن تو دن سے رات اچھی

محفلِ عیش کا بندھا وہ سماں،
دیکھے پھر پھر کے جس کو عمرِ رواں

دوستوں سے بھری بھری محفل
چشمِ بد دور وہ پری محفل

بزم آرا تھے سب عدو کے سوا
کوئی نکلا نہ آرزو کے سوا

میری محفل میں دخل غیر کہاں؟
غیر ہو جس جگہ تو خیر کہاں؟

عیش سا عیش تھا نصیبوں میں
کھل بلی پڑ گئی رقیبوں میں

ساری دنیا میں کیا کسی سے غرض!
اپنے معشوق کی خوشی سے غرض!

رات بھر تھا خوشی سے وہ عالم
اشکِ شادی تھا قطرۂ شبنم!

مسکراتے تھے لب جو دلبر کے
کھلے جاتے تھے پھول بستر کے

پھول بھی ناگوار تھے اس کو
ہار پھولوں کے بار تھے اس کو

ہر گھڑی نوک جھوک ہوتی تھی
دمبدم روک ٹوک ہوتی تھی

گرچہ دیکھے ہزار صورت دار
مگر ایسا کہاں طبیعت دار

قابلِ دید تھی کسی کی خوشی
اور اس پر ہمارے جی کی خوشی

خود بخود دل کھلا ہی جاتا تھا
قہقہہ لب پہ آ ہی جاتا تھا

کالی کالی گھٹائیں آتی تھیں!
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں

آتشِ حسنِ یار کی گرمی!
بزم میں اک بہار کی گرمی

گرچہ اکثر ہوا جنوبی تھی
پر وہ عطرِ حنا میں ڈوبی تھی!

چاندنی کے تمام شب جلسے — دلکشا سقف پر عجب جلوے

یاد ہے ایک رشکِ گل کی سیر — چودھویں رات کروہ پُل کی سیر

ایسی صحبت میں کیوں نہ دل پھنسے — دل لگی کے تھے سینکڑوں چرچے

رات عیش و نشاط میں گزری — صبح تک اختلاط میں گزری

مدعی لاکھ ڈر دکھاتے ہیں — وہ جو کہتے ہیں کر دکھاتے ہیں

داغ سے رسمِ التفات نہ جائے — سر بھی جائے تو جائے بات نہ جائے

لوگ سب خوش قماش خوش ترکیب — اہلِ تمیز و صاحبِ تہذیب

ہم سے سرگرمِ اتحاد رہے — عبدرزاق شاد و شاد رہے

دوست با وضع ہے کہاں پیدا — داغ اس وضع دار کا شیدا

میری رخصت کے دن تمام ہوئے — عیش و عشرت کے دن تمام ہوئے

جلد حاضر ہو یہ پیام آیا، — اور سر پہ مہِ صیام آیا

پھر تو میں ایک دم ٹھہر نہ سکا — دل کی صورت قدم ٹھہر نہ سکا،

اس طرح کس طرح سے رہ جاتے — ہوئے بادل برس نمک کھاتے

دل خدا نے دیا غیور بہت — تھا یہ پاسِ نمک سے دور بہت

گر نمک خوار حیلہ گر نکلے — تو نمک پھوٹ پھوٹ کر نکلے

یہ شرافت کا مقتضا ہی نہیں — کہ شریفوں سے یہ ہوا ہی نہیں

کب میسر ہو روزگار ایسا — اور آقائے نامدار ایسا

کچھ تمنا نہیں رہی مجھ کو — کون سی شے کی ہے کمی مجھ کو

میری رخصت سے انکو حیرت تھی — کہ یہ رخصت نہ تھی قیامت تھی

فکر تشویش رنج تھا غم تھا — عوض نغمہ شور ماتم تھا
اشک آنکھوں میں ڈبڈبائے ہوئے — پاس بیٹھے تو منہ بنائے ہوئے
وہ جو گھبرائے میری اُف اُف سے — تو یہ کہنے لگے تاسف سے
چند وابستہ ہیں ہمارے ساتھ — ورنہ ہو لیتے ہم تمہارے ساتھ
ہم عزیزوں کو چھوڑ دیں کیونکر — سلسلہ اُن سے توڑ دیں کیوں کر؟
تم بھی تنہا نہیں ستم یہ ہے — چھوٹتا ہے یہ ساتھ غم یہ ہے
جو میرے پاس ہے تمہارا ہے — تم کو لیکن یہ کب گوارا ہے
میں نے کی اختیار خاموشی — مجھ سے کب ہو نمک فراموشی
دل سے اپنے یہ گفتگو باہم — کیا رہے آئے کیا چلے کیا ہم
میں کہاں گریہ شبانہ کہاں — سر کہاں سنگ آستانہ کہاں
آبرو کا خیال آتا ہے — عرقِ انفعال آتا ہے
اپنے دلبر کو چھوڑ کر جائیں — ایسے جانے سے کاش مر جائیں
وہ وفادار بر ملا ٹھہرے — ہمیں قسمت سے بے وفا ٹھہرے
مضطرب ہو کے ہم ٹھہر نہ سکے — ایسے مجبور تھے کہ مر نہ سکے
اہلِ صحبت کو داغ دے کے چلے — اپنے دل کا جنازہ لے کے چلے
کیا کہیں جس طرح سے ہم آئے — ہمہ تن حسرت و الم آئے
میرے ہمراہ میر قطب الدین — اشک ریزاں بحالتِ غمگیں
میری غمخواریوں سے کام نہیں — میری دلداریوں سے کام نہیں
وہ مرے دل کو اس طرح لائے — کوئی گھائل کو جس طرح لائے

کچھ نہ تھی مجھ کو جسم و جاں کی خبر — نہ زمیں کی نہ آسماں کی خبر

ریل نے دو ہی دن میں پہنچایا — رمضاں ایک دن کے بعد آیا

دست بستہ حضور میں پہنچا، — بزم عیش و سرور میں پہنچا

مجھ سے دلشاد اک زمانہ ہوا — سور و لطف خسروانہ ہوا

مرضِ غم سے کب افاقہ تھا — دن کو روزہ تو شب کو فاقہ تھا

سحری اک زمانہ کھاتا تھا — رمضاں مجھ کو کھائے جاتا تھا،

صدمۂ ہجر و کاہشِ غم سے — عید بدتر ہوئی محرم سے

شادیانہ کا شور پیہم ہے — میں سمجھتا ہوں میرا ماتم ہے

یاس ہو تو امید پھر کیسی — دل نہ خوش ہو تو عید پھر کیسی

ہو کے خوش میں کبھی گلے نہ ملا — کفِ افسوس سے ملے نہ ملا

عشق میں ایک فکرِ ناداری — لاکھ بیماریوں کی بیماری

داغ کیوں غیر سے گلے ملتا — کاش یہ قبر سے گلے ملتا

ایسی صحبت ہو دل کو کیا مرغوب — ہجر محبوب و وصل نامرغوب

سر و ساماں کہاں مقدر میں — خاک اڑانے کو بھی نہیں گھر میں

کھانے پینے سے مجھ کو نفرت ہے — عید کو روزہ کیا مصیبت ہے؟

ہائے جب زہر بھی نہ پائیں ہم — کیا کلیجہ پروں کا کھائیں ہم

خونِ دل بھی کمی سی کرتا ہے — دیدۂ تر ہنسی سی کرتا ہے

لوگ سامانِ عیش کرتے ہیں — داغ ارمانِ عیش کرتے ہیں

شبِ فرقت جو آہ کرتا ہوں — تو خدا کو گواہ کرتا ہوں،

آہ فریاد کون سنتا ہے — داد بیداد کون سنتا ہے
درد دل ہم نشیں نہیں سنتا — کوئی سنتا نہیں، نہیں سنتا
کون یہ حال زار دیکھ سکے — کون یہ انتظار دیکھ سکے
دوستوں کے کلیجے پھٹتے ہیں — دشمنوں کے بھی دل الٹتے ہیں
گر کرے بھی اثر فغاں میری — خاک ہوں جل کے ہڈیاں میری
میں یہ مژدہ سنوں وہ آئی موت — کاش آئے مجھے پر آئی موت
بد دعا دیتے ہیں بشر مجھ کو — کھا گئے کوس کوس کر مجھ کو
تھے جو پروانہ سوز الفت سے — اب وہ جلتے ہیں میری صورت سے
پندگو اپنی اپنی بکتے ہیں — زخم دل پر نمک چھڑکتے ہیں
طعنے دے دیکے لوگ ہنستے ہیں — روز تیروں کے مینہ برستے ہیں
ہو رہی ہیں ملامتیں کیا کیا — ٹوٹتی ہیں قیامتیں کیا کیا
طنز کرتے ہیں یہ لطیف و ظریف — کہئے کیا ہے اب مزاج شریف
لو ذرا سا ہوا جو دل میلا — پیشتر مرگ سے ہے واویلا
ہم تو دیکھیں وہ خوب رُو ہے کہاں — ہم نشیں تو وہ خوش گلو ہے کہاں
تم نے دیکھا ہے تم نے برتا ہے — وہ تو مہر و وفا کا پتلا ہے
ایسی ہوتی ہے چاہ کیا کہنا — حضرتِ داغ واہ کیا کہنا
مہر و الفت اسی کو کہتے ہیں — کیا مروت اسی کو کہتے ہیں
ہے وہی آن بان میں پورا — اُترے جو امتحان میں پورا
جان جاتی ہے جن کے آنے سے — کھنچ گئے اور بھی بلانے سے

دلربا وہ جو اپنے پاس رہے ‌ ‌ ‌ ‌ نہ کہ ملنے کی اس سے یاس رہے

طرفہ یہ رسم و راہ نبھتی ہے ‌ ‌ ‌ ‌ آپ کی بے پناہ نبھتی ہے

بے وفا سے یقینِ الفت ہے! ‌ ‌ ‌ ‌ آپ کا دم بہت غنیمت ہے!

دل میں کچھ شرمگیں ہوا کہ نہیں ‌ ‌ ‌ ‌ اب بھی تجھ کو یقیں ہوا کہ نہیں

کچھ خطوں کی عبارتیں دیکھیں ‌ ‌ ‌ ‌ شوخ فقرے شرارتیں دیکھیں

خوب انعام تم کو ملتے ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ الٹے الزام تم کو ملتے ہیں

غیر کا جب وسیلہ ہوتا ہے ‌ ‌ ‌ ‌ عذر انکار حیلہ ہوتا ہے

غیرتِ مہر و ماہ وہ ہی تو ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ آپ کے خیر خواہ وہ ہی تو ہیں

ہم جو بولیں ہماری کیا طاقت ‌ ‌ ‌ ‌ بھید کھولیں ہماری کیا طاقت

صحبتِ انجمن چھٹے کیوں کر ‌ ‌ ‌ ‌ اُن سے اپنا وطن چھٹے کیوں کر

یوں ہی تڑپائیں گے رُلائیں گے ‌ ‌ ‌ ‌ مر بھی جاؤ گے تو نہ آئیں گے

وعدہ کیسا اگر کلام کریں ‌ ‌ ‌ ‌ ہم تو جھک کر تمہیں سلام کریں

یہ تو مانا وہ وضع دار بھی ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ یہ تو مانا وفا شعار بھی ہیں

یہ بجا ہے ستم نہیں کرتے ‌ ‌ ‌ ‌ جھوٹے قول و قسم نہیں کرتے

تم بڑے چین سے رہے سچ ہے ‌ ‌ ‌ ‌ تم سا ہشیار جو کہے سچ ہے

دھوم ہے جا بجا زمانے میں ‌ ‌ ‌ ‌ نام روشن کیا زمانے میں

یوں ہی ہوتے ہیں چار سو رسوا ‌ ‌ ‌ ‌ دربدر اور کو بکو رسوا

پیشتر جو نہیں کیا وہ کیا ‌ ‌ ‌ ‌ عمر بھر جو نہیں کیا وہ کیا

نہ سہی وصل غیر یوں ہی سہی ‌ ‌ ‌ ‌ کیوں بگڑتے ہو خیر یوں ہی سہی

سارے معشوق دیکھے بھالے ہیں ‏ — وہی دنیا سے اک نرالے ہیں

بے وفا جھوٹ باوفا کہیے — پاکدامن ہیں پارسا کہیے

بے وفائی انہیں نہیں آتی — کج ادائی انہیں نہیں آتی

بھولے بھالے ہیں گھات کیا جانیں — ابھی وہ اور بات کیا جانیں

آپ کا رنج و غم انہیں ہی تو ہے — پاس قول و قسم انہیں ہی تو ہے

خوبصورت نہیں کوئی ان سا — پاک طینت نہیں کوئی اُن سا

آپ دھونی رمائے بیٹھے ہیں — اُن پر ایمان لائے بیٹھے ہیں،

اپنے محبوب کا خیال رہے — سال دو سال تو یہ حال رہے

نہیں جچتا کوئی حسیں تم کو — آفریں ہے صد آفریں تم کو

کیوں کسی بت پہ ہاتھ صاف کرو — تم تو مسجد میں اعتکاف کرو

ترک کرنا نہ مہر و الفت کو — بخشوائیں گے وہ قیامت کو

دل پہ ہر وقت جبر کرتے ہیں — مرد ایسا ہی صبر کرتے ہیں

چپکے چپکے ہر اک کی سنتا ہوں — اپنے مطلب کی بات چنتا ہوں

کوئی تدبیر بن نہیں آتی — کوئی تقدیر بن نہیں آتی

کان ہر شخص کے بیاں کی طرف — نگہ یاس آسماں کی طرف

اے فلک کس بلا میں ڈال دیا — مجھ کو جنت سے کیوں نکال دیا

اے فلک تجھ پہ بس نہیں میرا — کوئی فریاد رس نہیں میرا

دل کو آزار ہو گیا کیسا — بخت بیدار ہو گیا کیسا،

کاہش غم سے روح گھٹتی ہے — آنکھوں آنکھوں میں رات کٹتی ہے

دل میں ہر وقت یاس رہتی ہے
کیا طبیعت اداس رہتی ہے

ہم جئیں گے، یہ آس ہے کس کو
ہجر میں بھوک پیاس ہے کس کو؟

یہ سزائیں ضرور ہیں تو نہیں
بے خطا ہوں قصور بھی تو نہیں

ہائے جیتے ہیں ہم نہ مرتے ہیں
کس قیامت کے دن گذرتے ہیں

خانۂ عیش لٹ گیا کیسا
مجھ سے معشوق چھٹ گیا کیسا

رات دن جی رہے ہیں مر کے ہم
صحبتِ یار ہو گئی برہم

ہم پریشان گھر میں پھرتے ہیں
کہ وہ جلسے نظر میں پھرتے ہیں

کوئی دن رات کا مزا نہ رہا
رات کیا؟ بات کا مزا نہ رہا!

کون ہے التفات کس سے کریں
ہم کنایہ کی بات کس سے کریں؟

دیدۂ منتظر ہے چار طرف
دلِ رشکِ آشنا ہزار طرف

درد اٹھتا ہے دل میں رہ رہ کر
بیٹھ جاتا ہوں "ہائے دل" کہہ کر!

سوزِ پنہاں سے گرم گرم آہیں
ناتوانی سے نرم نرم آہیں

وہ طبیعت سنبھالنے والے
میری حسرت نکالنے والے

دلربا ہے تو باوفا بھی ہے
شوخ ہے صاحبِ حیا بھی ہے

گرچہ مل جائے مہرباں ایسا
نہ ملے گا مزاج داں ایسا

یا الٰہی! نجات غم سے ملے!
وہ سراپا حجاب ہم سے ملے!

ورنہ اس کا خیال بھی نہ رہے
اب ہے جیسا یہ حال بھی نہ رہے

سرورق زین پریس، لاہور میں چھپا